اقبال کے سیاسی افکار

ظفر اقبال

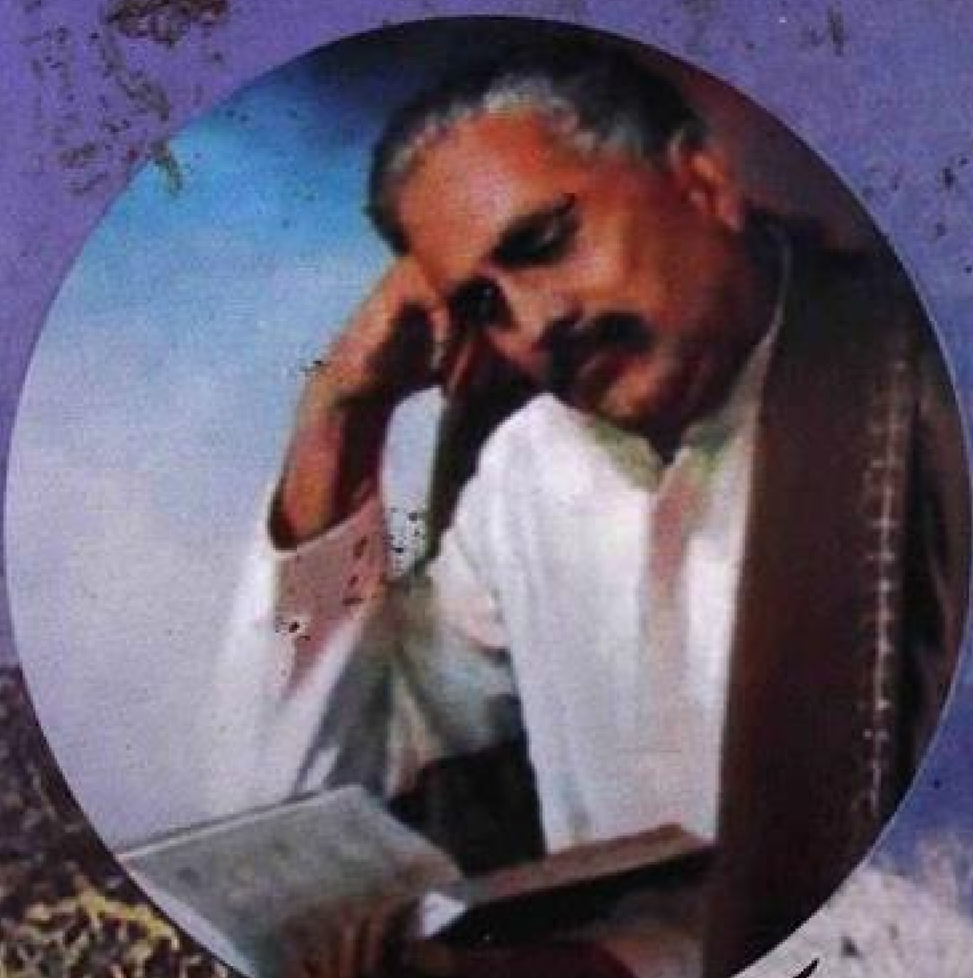

اقبال پبلی کیشنز
نئی دہلی

اقبال کے سیاسی افکار

ظفر اقبال

اقبال پبلی کیشنز، نئی دہلی

©Copyright Author

سلسلہ مطبوعات:۱

اقبال کے سیاسی افکار

از: ظفر اقبال

IQBAL KE SIYASI AFKAR

By: Zafar Iqbal

طبع اول	مئی ۲۰۱۳
صفحات	۱۱۱
قیمت (مجلد)	۲۰۰ روپے
(غیر مجلد)	۱۲۰ روپے

ملنے کا پتہ: C-24، کنیزہ اپارٹمنٹ، تھرڈ فلور، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

فون: 9958361526

Published by:

Iqbal Publications, New Delhi

فہرست

حرفِ آغاز ۴

باب اوّل

اقبال کا عہد: سیاسی اور سماجی پس منظر ۷

اقبال کی سیاسی وابستگی ۳۱

لیگ کے اجلاس الہ آباد کی صدارت ۳۵

باب دوم

اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار

پہلا دور ۳۹

دوسرا دور ۵۰

باب سوم

اقبال کا ملی تصور ۵۸

عالم اسلام کے تناظر میں

خلاصہ کلام ۱۰۷

کتابیات ۱۱۱

☆☆☆

حرف آغاز

اقبالؔ بیسوی صدی کے عظیم متفکر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بہت کام ہو چکا ہے۔ لیکن بہت سے گوشے ایسے ہیں جنہیں تفصیل سے روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ جن میں سے ایک کا تعلق اقبالؔ کی سیاسی بصیرت سے ہے۔

میرے مقالے کا عنوان ''اقبالؔ کی شاعری میں سیاسی موضوعات'' ہے۔ جس میں اقبالؔ کی شاعری میں ان سیاسی پہلوؤں کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں انہوں نے اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے۔ اس مقالہ میں خاص طور سے ''کلیات اقبال (اردو)'' ہمارے پیش نظر ہے۔

مقالے کو تین ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''اقبال کا عہد: سیاسی و سماجی پس منظر'' ہے، جس کے تحت کوشش کی گئی ہے کہ اقبالؔ نے جس ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں اس کا مختصر طور سے احاطہ کیا جائے، تاکہ اس موضوع کا کسی حد تک حق ادا ہو سکے۔ اس باب میں اقبال کے عہد، اس کے پس منظر یعنی سیاسی، سماجی اور تاریخی واقعات کے حوالہ سے ان اسباب و عوامل کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اقبال کی فکر کو ایک نئی سمت اور جہت دینے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی باب میں مغلوں کے زوال کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی پستی کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی کوششوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ خاص طور سے سرسید اور ان کے رفقاء کے کارنامے پر بحث کی گئی ہے۔ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو باعزت مقام دلانے اور ہندوستانی مسلمانوں کے زوال پر بند باندھنے کی جو کوششیں کی ہیں۔ انہیں کسی حد تک تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد علی گڑھ اور دیو بند تحریک کو بھی زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تمام واقعات کا ضمناً ہی صحیح لیکن کسی حد تک احاطہ ہو گیا ہے۔

دوسرے باب میں اقبالؔ کی شاعری کے مختلف ادوار پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی شاعری کو ادوار میں بانٹا گیا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا پہلا دور ان کے یورپ کے سفر تک کے عرصہ پر محیط ہے جبکہ دوسرا دور یورپ سے واپسی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اقبالؔ اپنی شاعری کے پہلے دور میں وطن کی محبت میں جس طرح سرشار نظر آتے ہیں وہ غیر معمولی ہے۔ چنانچہ ابتدائی دور کی نظموں مثلاً ہمالہ، نیا شوالہ، تصویر درد، صدائے درد، ترانہ ہندی وغیرہم میں حب الوطنی کے جذبات جس پرسوز انداز میں پیش کیے گئے ہیں وہ صرف انہی کا خاصہ تھا۔ لیکن دوسرے دور یعنی یورپ سے واپسی کے بعد ان کے خیالات میں یکسر تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور وہی اقبالؔ جو وطن کی محبت میں سرشار نظر آتے تھے اچانک بدلے ہوئے انداز میں نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری نہ صرف اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے بلکہ فکری سطح پر ایک عظیم الشان تغیر کی نشاندہی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وطنیت کا محدود تصور اب ایسے آفاقی تصور میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کا محور اسلام ہے۔ ان کی شاعری اب اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں ان اسباب اور محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس تبدیلی کے پس پردہ کارفرما تھے۔

تیسرے باب میں اقبالؔ کی شاعری کے دوسرے دور کے ان پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی شاعری کا مرکزی موضوع ہیں اور جس کا مقصد اس پریشان حال امت مسلمہ کو بیدار کرنا ہے جو آج ہر شعبہ حیات میں غیروں سے رحم کی بھیک مانگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اقبالؔ کی ساری توجہ اس پر ہے

کہ اس امت کو دوبارہ کیسے عروج حاصل ہو اور اس امت کی عظمت رفتہ کی بحالی کس طرح کی جائے، اس حوالہ سے انہوں نے اپنی ملی شاعری کے ذریعہ امت مسلمہ کو جو مفید مشورے دیئے ہیں اگر ان پر شرح صدر کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ امت دوبارہ بام عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ عالم اسلام اور اقوام عالم پر اقبالؔ کی گہری نظر تھی وہ دنیا میں پل پل رونما ہونے والے حالات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور باریک بینی کے ساتھ ان کا تجزیہ کرنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے جن کی مثالیں ان کی شاعری میں بکھری ہوئی ہیں اور جس پر اس باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ دراصل میرے ایم فل کا مقالہ ہے، جو ۱۳-۲۰۱۱ میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس مقالے کی تیاری میں مفید مشوروں اور رہنمائی کے لئے میں اپنے شعبہ کے سبھی اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ خاص طور سے پروفیسر ابن کنول صاحب، پروفیسر ارتضی کریم صاحب، ڈاکٹر تنویر احمد صاحب اور صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی اور اپنے شفیق نگراں پروفیسر توقیر احمد خاں کا شکریہ لازم ہے۔ جنہوں نے قدم بہ قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور بہت سے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ جن کے نتیجہ میں یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچ سکا۔

اس مقالے کی تکمیل میں میں اپنے خیر خواہوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا جن کے مفید مشوروں کی مدد سے میں یہ مقالہ لکھ سکا۔

مئی ۲۰۱۳

ظفر اقبال

باب نمبر اوّل

اقبال کا عہد: سیاسی وسماجی پس منظر

علامہ اقبال کا تعلق جس عہد سے ہے وہ زمانہ تمام ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں کیلئے نہایت ہی پر آشوب تھا۔ ان کی ہزار سالہ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ ایک نیا نظام پوری قوت و جاہ وجلال کے ساتھ ان کے اوپر مسلط ہو چکا تھا۔ مسلمان ہر شعبہ حیات میں خواہ سیاسی ہو، سماجی یا معاشی پوری طرح سے ایک اجنبی قوم کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کی شروعات خاص طور سے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی ۱۷۰۷ء میں وفات کے بعد تیزی سے ہونے لگی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں میں کوئی بابر و ہمایوں جیسا بیدار مغز اور جہانگیر اور شاہجہاں جیسا وسیع خیالات کا حامل نہیں تھا جو اس عظیم مغل سلطنت کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر احسن طریق سے اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ بالآخر اورنگ زیب کی وفات کے فوراً بعد ہی تمام ہندوستان میں افراتفری مچ گئی۔ ہندوستان کے تمام صوبے ایک کے بعد ایک مختاری کا اعلان کرتے چلے گئے۔ اسی اتفراتفری کو دیکھ کر شاہ عبدالرحیمؒ نے مغل سلطنت کے ایک بیدار مغز اور صالح اور بارسوخ امیر نظام الملک آصف جاہ کو جہاد کے تئیں آمادہ کرنے اور اس مغل حکومت میں جو کچھ بچ گیا ہے اس کو بچانے کی تلقین کرنے کے لئے خط لکھا۔

مغل حکومت کے کمزور ہونے کے بعد مختلف ریاستوں کے مرکز سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے وہ ریاستیں بھی آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے لگیں۔ جنوب میں انگریزوں کی طاقت

کمزور تھی عالمگیر کی وفات کے بعد کمپنی نے اپنی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اسی افراتفری کو دیکھتے ہوئے ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور ۱۷۳۹ء میں دہلی میں داخل ہو گیا۔ نادر شاہ نے دلی کو دل کھول کر لوٹا اور یہاں کے عوام کا قتل عام کیا۔ لال قلعہ سے بیش قیمت تخت طاؤس اور مشہور زمانہ ہیرا کوہ نور وہ اپنے ساتھ ایران لیتا گیا۔

نادر شاہ کے حملے اور دہلی کی تباہی کے بعد مغلوں کی طاقت کا جو بھرم تھا وہ بھی پوری طرح سے مسمار ہو گیا۔ دلی کی اس تباہی کے بعد ہندوستان میں ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ ہندوستان میں مختلف علاقائی اقوام اقتدار کی دوڑ میں شامل ہو گئیں۔ پنجاب میں سکھوں نے افراتفری مچادی۔ اسی طرح مراٹھوں نے ملک کے دیگر علاقوں میں غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس تباہی کے بعد مغلوں کی حالت بہت ہی دگر گوں ہو گئی وہ ایک طرح سے مختلف صوبیداروں اور علاقائی سرداروں کے رحم و کرم پر ہو گئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک صوبیدار کو حکومت کا پروانہ جاری کیا جاتا ٹھیک کچھ دنوں کے بعد اسی علاقے کے دوسرے صوبیدار کو اسی صوبے کا پروانہ جاری کر دیا جاتا۔ مغل حکمراں بالکل بے بس ہو گئے۔ ایسے میں غیر ملکی طاقتوں خاص طور سے انگریزوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ بنگال میں علی وردی خاں کی وفات کے بعد سراج الدولہ جب برسر اقتدار آیا تو انگریزوں نے موقع کو غنیمت جان کر بنگال پر حملہ کر دیا۔ سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کی غداری کے باعث پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شہادت ہوئی۔ جس کے بعد انگریزوں کی طاقت میں زبردست اضافہ ہوا اور وہ ہندوستان کے سب سے زرخیز علاقے کے مالک بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کو اتنا بڑا خزانہ ہاتھ لگا کہ یہ خزانہ جب برطانیہ پہنچا تو اس دولت کی مدد سے یورپ میں اور خاص طور سے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کی داغ بیل پڑی۔ اس خزانے کی بدولت بڑے بڑے کارخانے لگائے گئے۔

بنگال کی حکومت انگریزوں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد مغل اور کمزور ہو گئے۔ ہندوستان میں بنگال ہی ایک ایسا علاقہ تھا جو اناج کے معاملے میں پورے ہندوستان کی ضروریات پوری کرتا تھا وہ

علاقہ مغلوں کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اسی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مہاراشٹر میں مراٹھا پوری قوت سے اٹھے۔ انہوں نے اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی۔ وہ دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ اسی مراٹھا طاقت کو توڑنے کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہندوستان میں روہیل کھنڈ کے نجیب الدولہ اور افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو اس کے لئے تیار کیا کہ وہ ہندوستان میں آ کر مراٹھوں کا زور توڑے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں مراٹھوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس جنگ میں فاتح احمد شاہ ابدالی مراٹھوں کو شکست دینے اور مغل بادشاہ شاہ عالم کو حکومت میں برقرار رکھنے کے بعد لوٹ گیا، احمد شاہ ابدالی نے حکومت یا نظم و نسق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جس کی وجہ سے جو خرابیاں اور کمزوریاں پہلے تھیں وہ ہنوز برقرار رہیں۔ اس عظیم فتح کے بعد تبدیلی آنی چاہئے تھی لیکن صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

۱۷۶۵ء میں بکسر کی جنگ میں جو انگریزوں اور مغل فوج کے درمیان ہوئی، مغل شکست سے دوچار ہوئے اور مغل بادشاہ شاہ عالم انگریزوں کی قید میں چلے گئے اور شاہ عالم کو انگریزوں نے الہ آباد کے قلعہ میں قید کر دیا۔ دہلی میں تخت خالی پڑا ہوا تھا اور بادشاہ الہ آباد کے قلعہ میں مقید تھا۔ اس نازک صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مراٹھوں نے انگریزوں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ مغل بادشاہ شاہ عالم کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ بنگال کی دیوانی انگریزوں کو سپرد کی جائے۔ بادشاہ کی رہائی کے عوض انگریزوں کو بنگال کی دیوانی دے دی گئی۔ اس طرح بادشاہ آزاد ہو گیا لیکن اس کے بدلے دہلی میں مراٹھوں کا زور بڑھ گیا۔ بادشاہ ایک طرح سے مراٹھوں کا یرغمال ہو گیا۔ مراٹھا دہلی میں جو چاہتے وہی ہوتا۔ مراٹھا پانی پت کی جنگ کو نہیں بھولے تھے جو ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی تھی۔ وہ اس ہزیمت کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ خاص طور سے روہیل کھنڈ کے نجیب الدولہ کے خاندان سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اس وقت نجیب الدولہ کا تو انتقال ہو چکا تھا لیکن اس کا بیٹا ضابطہ خان برسر اقتدار تھا۔ مراٹھوں نے شاہ عالم کو اس کے لئے تیار کیا اور دوسری طرف اودھ کے نواب شجاع الدولہ کو اس کے لئے آمادہ کیا کہ اگر روہیل کھنڈ کے خلاف لڑائی میں ان کا ساتھ دے تو وہ روہیل کھنڈ کو اودھ کا صوبہ بنانے کے لئے تیار ہیں۔ اس لالچ

میں شجاع الدولہ نے مراٹھوں کا ساتھ دینے کی حامی بھرلی۔ ان تینوں افواج نے مل کر روہیل کھنڈ پر حملہ کیا اور روہیل کھنڈ میں ان لوگوں نے زبردست تباہی مچائی اور خاص طور سے ضابطہ خان اور ان کے خاندان کی عورتوں کے ساتھ نازیبا حرکت کی اور اس کے خاندان کی عورتوں کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر مراٹھے اور مغل سردار اپنے خیمے میں لے گئے۔ ضابطہ خان اس جنگ میں مارا گیا اور اس کا بیٹا اس وقت دس بارہ سال کا بچہ تھا جس کا نام عبدالقادر روہیلہ تھا۔ عبدالقادر روہیلہ جب بڑا ہوا اور اس نے دوبارہ روہیل کھنڈ میں دھیرے دھیرے اپنی طاقت بڑھائی اور جب وہ حکمراں ہوا تو اس نے شاہ عالم سے زبردست انتقام لیا۔ ۱۷۷۸ء میں اس نے دہلی پر حملہ کیا اور دہلی پر قبضہ کرلیا اور دہلی کے لال قلعہ میں اس نے بھرے دربار میں شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھوں پر گرم سلائیاں پھروادیں۔ انہی حالات کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے مشہور شاعر میر تقی میرؔ نے یہ مشہور شعر کہا:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

دونوں آنکھوں سے اندھا بادشاہ شاہ عالم ۱۸۱۰ء تک اس تخت پر متمکن رہا جب تک اس کی موت واقع نہ ہوگئی ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت میں بادشاہ کا کتنا عمل دخل رہا ہوگا۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور مغل بادشاہ کا عمل دخل صرف لال قلعہ تک محدود ہوگیا۔ بادشاہ کا وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ یہ مغل بادشاہ ایک کے بعد ایک برسراقتدار آتے گئے بالآخر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ساتھ یہ حکمرانی بھی جو قلعہ تک محدود تھی، آزادی کی پہلی لڑائی کی ناکامی کے بعد ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگئی اور ہندوستان مکمل طور سے تاج برطانیہ کا باضابطہ حصہ بن گیا۔ بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں جلاوطن کردیا گیا۔ اس سے پہلے ۱۸۵۶ء میں اودھ پر کمپنی کا قبضہ ہوگیا تھا اور اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو کلکتہ میں جلاوطن کردیا تھا۔

جنوب کی ریاستوں میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے تقریباً نصف صدی تک انگریزوں کے قدم کو روکے رکھا لیکن نظام اور مراٹھوں اور انگریزوں کی مشترکہ فوج کے سامنے ٹیپو سلطان کی ایک نہ چلی اور

۱۷۹۹ء میں سقوط سرنگا پٹنم کا سانحہ پیش آ کر رہا۔ ایک بہادر اور رعایا پرور اور سچے محبّ وطن و محبّ اسلام کو شہادت نصیب ہوئی۔ اس طرح ایک زبردست اور طاقتور قوم انگریزوں کی غلام ہوگئی۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے انگریزوں کو سب سے زیادہ خطرہ بھی مسلمانوں سے ہی تھا۔ مسلمانوں نے انگریزوں کی سب سے زیادہ مزاحمت کی تھی۔ اس لئے انگریزوں کی پوری کوشش تھی کہ وہ مسلمانوں کو ہر سطح پر اس طرح کمزور کردیں کہ وہ دوبارہ ان کے لئے خطرہ نہ بن سکیں۔ اس خطرے کے سدباب کے لئے انگریزوں نے مسلمان کے بالمقابل یہاں کی ہندو آبادی جو مسلمانوں کے مقابلے میں اکثریت میں تھی کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھنے شروع کئے۔ خاص طور سے بنگال میں مسلمانوں کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ تمام سرکاری نوکریوں میں ہندو بنگالی کو بھر دیا گیا اور صرف ایک دو مسلمان چپراسی کسی دفتر میں ملازم تھے۔ شمالی ہند کے مسلمان بنگال کے مسلمانوں سے تھوڑی بہتر حالت تھے۔

ایسے ہی حالات تھے جس میں سرسید نے جن کی پیدائش ۱۸۱۷ء میں ہوئی تھی۔ پوری تندہی کے ساتھ مسلمانوں کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ سرسید نے ملازمت کی ابتدا صدر امین کے طور پر کی۔ پھر ۱۸۴۱ میں منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں دہلی، بجنور، غازی پور، مراد آباد، بنارس میں مقیم رہے۔ ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن لے کر علی گڑھ میں آ گئے۔

سرسید نے پینتیس سال ملازمت کی اور بڑی ہی نیک نامی سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے ساتھ انہوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

ان کی آثار الصنادید کتاب زیادہ مشہور ہوئی جس میں انہوں نے کافی عرق ریزی کے ساتھ دہلی اور اس کے نواح کی عمارات کی تاریخ لکھی جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں گارساں دتاسی نے کیا تھا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے ۱۸۶۴ء میں سرسید کو آنریری فیلو منتخب کیا۔ اس کتاب کے علاوہ سرسید نے آئین اکبری، تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی اور تزک جہانگیری کو شائع کرایا اور تاریخ

سرکشی بجنور مرتب کی۔

سر سید احمد بریلوی کی وہابی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ بلکہ وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلی کے پوتے شاہ عبدالعزیز کے شاگرد بھی تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں علی الاعلان اپنے آپ کو وہابی کہا تھا۔ جس وقت تمام وہابی باغی مانے جاتے تھے۔ بعد میں سر سید کے عقائد میں تبدیلی واقع ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اندر اصلاحی جوش پوری زندگی باقی رہا۔

سرکاری ملازمت کے زمانے میں سر سید کا تصنیف وتالیف کے علاوہ سب سے محبوب مشغلہ اشاعت تعلیم تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا مدرسہ انہوں نے مرادآباد کا فارسی مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ ۱۸۵۹ء میں قائم ہوا اور ۱۸۶۴ء میں ایک اسکول غازی پور میں قائم کیا جس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ان دونوں اسکولوں کے قیام سے زیادہ بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ سائنٹفک سوسائٹی غازی پور کا قیام تھا۔ جو ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس سوسائٹی کا خاص مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے، سوسائٹی کے سرپرست تھے اور پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نائب سرپرست تھے۔ اس سوسائٹی کا آغاز غازی پور میں ہوا تھا لیکن جب سر سید علی گڑھ میں چلے گئے تو سوسائٹی بھی ان کے ساتھ وہاں منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی کے تحت مختلف علمی موضوعات پر تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ اس سوسائٹی نے مغربی زبانوں خاص طور سے انگریزی سے اردو میں کئی کتابوں کے ترجمہ کرائے اور شائع کیا۔ اس سوسائٹی کے تحت ایک اخبار بھی نکلتا تھا۔ اس اخبار کے تحت ایک کالم انگریزی میں ہوتا تھا اور دوسرا کالم اردو میں ہوتا تھا۔ اس اخبار کے بیشتر مضامین کا تعلق ہندو اور مسلمانوں کے سماجی اصلاحات سے تھا۔

سر سید نے تعلیم کی ترویج کے سلسلہ میں جو کوششیں کی تھیں، ان میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی تفریق نہیں تھی چاہے مرادآباد کا مدرسہ ہو یا غازی پور کا اسکول یا سائنٹفک سوسائٹی ان سب میں ہندو برابر کے شریک تھے۔ دونوں طبقے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے لیکن سر سید کے قیام بنارس کے دوران کچھ ایسے واقعات ہوئے، جنہوں نے ان کے زاویہ نگاہ میں بڑی تبدیلی پیدا کردی۔ ان واقعات

نے سرسید کے خیالات میں انقلابی تبدیلی لا دی۔ ان واقعات کے تعلق سے مولانا حالی حیات جاوید میں رقمطراز ہیں:

> ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جاوے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جاوے۔
>
> سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ''انہی دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور متعجب میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر کار انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقعہ ہے میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، وہ دیکھے گا۔'' انہوں نے کہا ''اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔'' میں نے کہا ''مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔'' (۱)

سرسید احمد خان بنارس ہی میں تھے کہ ان کے بیٹے سید محمود کو حکومت کی طرف سے انگلستان میں

تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک معقول وظیفہ ملا۔ سرسید بھی ان کے ساتھ ولایت روانہ ہوئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ ولایت کے لئے روانہ ہوئے۔ اٹھارہ انیس ماہ رہنے کے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ اس عہد میں وہ زیادہ تر خطبات احمدیہ کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کو قریب سے انگریز قوم کی ترقی اور معاشرتی زندگی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' نامی ایک رسالہ کا اجراء کیا۔ اس رسالہ میں عموماً خشک مضامین ہوتے تھے۔ اس رسالہ میں مذہب کے تعلق سے کچھ ایسی باتوں کا ذکر ہوتا تھا جو سلف کے تفہیم کے ماوراء تھا جس کی وجہ سے ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ تہذیب الاخلاق کی مخالفت اس کی انگریزی ترویج کے تعلق سے مضامین کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ سرسید کے مذہبی خیالات کی وجہ سے ہوئی۔

بقول شیخ خواجہ اکرام کے جوموج کوثر میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''تہذیب الاخلاق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو جاری ہوکر چھ سال کے بعد بند ہوگیا۔ تین سال بعد پھر جاری ہوا اور دو برس پانچ مہینے جاری رہ کر پھر بند ہوگیا۔ اس کے بعد بارہ سال کے وقفے سے ۱۸۹۴ء میں اس کا تیسرا دور شروع ہوا۔ لیکن تین سال کے بعد علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ شامل ہوگیا۔'' (۲)

تہذیب الاخلاق کو پہلی مرتبہ بند کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

> ''......تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا، جس کا اصلی مقصود قوم کو اسکی دینی اور دنیوی ابتر حالات کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا مگر مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے پانی میں تحریک کا پیدا کرنا تھا۔ یقین تھا کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے زیادہ بدبو پھیلے گی مگر حرکت آجانے سے پھر خوشگوار ہوجانے کی توقع ہوتی تھی۔'' (۳)

تہذیب الاخلاق سے سرسید کی مخالفت ہوئی لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سے قوم میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو علی گڑھ یونیورسٹی

کے جلسہ اسناد میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اغلب خیال یہ ہے کہ عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات تہذیب الاخلاق نے چھوڑے ہیں، ہندوستان کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے۔ اس رسالے کی اجرا سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا، جو تہذیب الاخلاق کے حلقہ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دور جدید کے بلند معیار مصنفین نے اسی خوانِ نعمت سے لقمے چنے اور اسی حلقہ کے اثر ونفوذ سے نقد وبصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے۔'' (۴)

۱۸۷۰ء میں سرسید ولایت سے واپس آئے۔ واپسی پر انہوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی۔ اس کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے۔ چنانچہ ''محمڈن فنڈ کمیٹی'' قائم ہوئی۔ حکومت کو اس فیصلے کی اطلاع دی گئی تھی، اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ حکومت نے بھی اس میں مالی تعاون پیش کیا۔ ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مجوزہ کالج کے متعلق مکمل اسکیم پیش کی۔ جسے کمیٹی نے منظور کیا۔ اس کے بعد یہ طے ہوا کہ علی گڑھ میں جہاں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا، پہلے ایم اے او ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ سرسید اس زمانے میں بنارس میں تھے۔ اسکول کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان سکریٹری علی گڑھ کمیٹی کو کرنا پڑا۔ انہوں نے اس کام کو اپنی انتھک کوششوں سے سرانجام دیا۔ سرولیم میور کے ہاتھوں ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اسکول کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔

نظام حیدر آباد نے علی گڑھ کالج کے مد میں خطیر رقم دی، مہاراجہ پٹیالہ، نواب رام پور و دیگر لوگوں کے چندوں اور مختلف انفرادی لوگوں کے پیسوں سے کالج فنڈ کمیٹی کی مالت حالت بہت مستحکم ہوگئی۔ سرسید جو اس وقت بنارس میں تھے ۱۸۷۶ء میں پنشن پا کر آ گئے اس کے بعد ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ

لٹن کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا۔

کالج کے قیام میں مسلمانوں کے تمام روشن خیال اور باا ثر مسلمانوں کی مدد شامل حال رہی لیکن ایک طبقے کی طرف سے بہت مخالفت ہوئی۔اس مخالفت میں عام اور خاص دونوں لوگ شامل تھے۔ اصل وجہ انگریزی زبان کا رائج کرنا نہیں بلکہ خود سرسید احمد کے نظریات تھے جو وقتاً فوقتاً تہذیب الاخلاق کی زینت بنتے رہتے تھے اور اس لئے اس طبقے کا خیال تھا کہ جس شخص کے نظریات اسلام مخالف ہوں اس شخص کا قائم کردہ کالج بھی اسی نظریات کا حامل ہوگا۔اس لئے لوگ سرسید کی مخالفت کرتے تھے۔

شیخ اکرام اپنی کتاب موجِ کوثر میں رقمطراز ہیں؛

> ''سرسید نے جب تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ ان خیالات کا اظہار کیا جنہیں عام مسلمان تعظیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے۔ مثلاً طیور مختقہ اہل کتاب کے کھانے کا جواز، اجنہ کے وجود سے انکار، آسمانوں کے متعلق عام نقطہ نظر کی تردید، حدیث تحبہ کی صحت سے انکار وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد وخیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ یہ کام انہوں نے خالص اسلامی ہمدردی سے متاثر ہوکر کیا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کی مخالفت لازمی اور قدرتی تھی۔'' (۵)

اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جس کی وجہ سے سرسید کی اس قدر مخالفت ہوئی۔

علی گڑھ کالج کی خوش قسمتی تھی کہ اس کالج کو شروع سے ہی قابل اساتذہ ملے، جنہوں نے کالج میں تعلیمی ماحول کا حد درجہ خیال رکھا اور کالج کی فضا کو خوشگوار بنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ خاص طور سے فلسفہ کے پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ اور انگریزی پروفیسر رالے اور فارسی کے استاذ کی حیثیت سے مولانا شبلی نعمانی وغیرہم کی تعلیمی خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔

سرسید نے ۱۸۸۶ء میں نیشنل کانگریس کے قیام کے ایک سال بعد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اس ایجوکیشنل کانفرنس کے بینر تلے تمام مسلم علاقوں میں مسلمانوں کو تعلیم کے تیئں بیدار کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف جو اہم تقریر کی تھی وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں کی تھی۔

سرسید کے اہم رفقاء میں مولانا الطاف حسین حالؔی کی شخصیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ حالؔی نے سرسید کی تعلیمی کوششوں کی حددرجہ حمایت کی۔ حالی کو سرسید سے شروع سے ہی خاص انسیت تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔ حالؔی ''حیات جاوید'' میں سرسید کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو احسن طریقے سے سمیٹنے کی کوشش کی، وہ اس میں حددرجہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

حالؔی کی سب سے بڑی خدمت اردو شاعری کی اصلاح ہے۔ انہوں نے دیوان حالؔی کے شہرہ آفاق (مقدمہ شعروشاعری) میں پرانی شاعری کی خامیاں اور جدید شاعری کے اصول عقل اور سمجھ اور قابلیت سے سمجھائے اور شاعرانہ تنقید پر ایک دستور وضع کیا۔ اس لئے حالی کا مقدمہ شعروشاعری جو دراصل ان کے دیوان کا مقدمہ ہے اس کتاب کو اردو تنقید کی سب سے پہلی کتاب کہا جاتا ہے۔ جدید اردو شاعری کے بانی کی حیثیت سے ان کی پہچان مسلم ہے۔ حیات سعدی، حیات جاوید اور اردو کی مقبول سوانح عمری یادگار غالبؔ جیسی کتابیں انہیں کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ اردو ادب کی جتنی خدمت انہوں نے کی اتنی شاید کسی اور نے نہ کی ہوگی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری میں ''مسدس حالؔی'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسدس حالؔی نے مسلمانوں کی بیداری میں جو کارنامہ انجام دیا وہ صرف انہیں کی دین ہے۔ سرسید اس کتاب کی اہمیت سے واقف تھے۔ مسدس ان کی ایما پر لکھی گئی اور وہ کہتے ہیں ''بیشک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو دنیا سے کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ میں حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں !!۔''

اس عہد کی پستی کا مولانا الطاف حسین حالؔی نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ غیر معمولی اہمیت اور سچائی سے

بہت قریب ہے۔

شیخ محمد اکرام موجِ کوثر میں رقمطراز ہیں کہ

مولانا حالی کے مسدس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں ایک دعوت کا ذکر کیا ہے، جو ان کے ماموں زاد بھائی کے ختنے پر پنجاب کے ایک گاؤں میں ہوئی، اس میں انہوں نے ساحرانہ اثر کی تصویر کھینچی ہے مسدس کے سننے سے ''ان پڑھ اجڈ گنواروں'' پر ہوتا تھا وہ لکھتے ہیں:

صبح کا وقت تھا۔ میدان میں بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا اور اس میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ شامیانے سے بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے کسان اور مزدور تھے۔ اتنے میں ایک طوائف اٹھی۔ جو لاہور سے لائی گئی تھی...... اس نے کھڑے ہو کر مجمع پر ایک نظر ڈالی اور یکبارگی مسدس حالی کو گانا شروع کیا۔

کسی نے یہ بقراط سے جائے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

جب تک وہ گاتی رہی، سناٹے کا عالم رہا۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ آبدیدہ تھے۔ وہ سماں اب تک میری نظروں کے سامنے ہے اور وہ گانا اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔'' (٦)

مسدس حالی نے قوم کی بیداری کے تعلق سے جو کارنامہ انجام دیا وہ کام کانفرنس یا دیگر ذرائع سے ممکن نہیں تھا وہ کام اس مسدس نے کیا۔ اس مسدس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی زبان بہت زیادہ سادہ تھی جو خاص و عام دونوں میں مقبول ہوئی۔ مسدس حالی کے چند بند ملاحظہ ہوں جس میں رسول اکرمؐ کے اعمال حسنہ پر خاص زور دیا گیا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوی
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطاکار سے درگذر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیرو شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

جس زمانے میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ مسلمان ایک دوسرے سے کدورت رکھتے تھے اور امراء اپنے میں مگن تھے اور غریبوں کا پرسان حال کوئی نہیں تھا۔ مسلمانوں اس قدر پستی پر پہنچ گئے تھے کہ غیر اس پر ہنستے تھے۔ ایسے ماحول میں حالؔی نے مسدس کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان ایک صور پھونکا۔ شاید یہاں کے مسلمان اس اخلاقی بدحالی سے باہر نکل سکیں۔

اسی زمانے میں ایک انگریز نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ شروع میں نیشنل کانگریس کا ایک مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم فراہم کیا جائے جس کے توسط سے وہ اپنی بات حکومت تک پہنچا سکے۔ بلکہ ایک طرح سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جمہوری طریقے سے ایک پلیٹ فارم فراہم کیا گیا۔ بعد میں دھیرے دھیرے کانگریس پر ہندو رہنماؤں کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ مسلمانوں اس سے دور دور ہی رہے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی

سرسید کانگریس کے سخت مخالف تھے۔ سرسید اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے تھے کہ جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی وہاں مسلمانوں کو انصاف نہیں مل سکے گا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کو ہندوستانیوں کا ایک نمائندہ جماعت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ شروع میں سرسید کی کانگریس کے تئیں منفی رائے کی وجہ سے مسلمان اس جماعت سے دور ہی دور رہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ جماعت کی بنیاد مسلم لیگ کے نام سے رکھی گئی۔ جو خالص مسلمانوں کی جماعت تھی۔ اس طرح دونوں پارٹیاں اپنے اپنے فرقوں کے مسائل انگریزوں کے سامنے اپنے اپنے پلیٹ فارموں کے ذریعہ رکھنے لگیں۔ مسلم لیگ میں شروع سے ہندوستان کے متمول لوگوں کا بول بالا رہا۔ لیکن کانگریس سے ہر طبقے کے افراد وابستہ رہے۔ شروع میں کانگریس کے بڑے لیڈروں میں مدن موہن مالویہ اور موتی لعل نہرو کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن جب موہن داس کرم چند گاندھی نے جو بعد میں مہاتما گاندھی کے نام سے معروف ہوئے کانگریس کی باگ ڈور ۱۹۱۴ء میں سنبھالی تو ہندوستان میں تحریک آزادی جو ایک طرح سے جمود کا شکار ہوگئی تھی اس میں تیزی آئی۔ گاندھی جی نے اپنی عدم تشدد کے فلسفہ کے ساتھ تحریک آزادی کو تیزی سے آگے بڑھانے میں جو رول ادا کیا وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ گاندھی جی نے ایک مرحلے پر محسوس کیا کہ کانگریس میں ایک فرقے کے افراد کی شمولیت رہی اور مسلمانوں اس پارٹی سے دور رہے تو آزادی کی لڑائی کمزور ہو جائے گی۔ انہوں اس بات کی کوشش کی اس جماعت میں مسلمانوں اور سکھوں اور دیگر تمام فرقوں کے افراد کی اس پارٹی میں شمولیت کو یقینی بنایا جائے تب ہی ہم کامیابی سے ہم کنار ہوسکتے ہیں۔

مسلمانوں کے بڑے لیڈروں میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸۔۱۹۵۸ء) کی شخصیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے اپنے کیریر کی شروعات ایک اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر کی اور انہوں نے اپنے اخبار الہلال اور بعد میں البلاغ کو جاری کیا۔ ان دونوں اخباروں نے آپ کو ایک نئی پہچان دی اور آپ کی صلاحیت نکھر کے لوگوں کے سامنے آئے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ کانگریس کے صدر بنے

اوراس کے بعد وہ مختلف عہدوں پر برقرار رہے اور ہندوستان کی آزادی سے ذرا پہلے پھر وہ کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ آزادی کے بعد انہوں نے مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے یہ وزارت ان کی وفات تک ان کے پاس رہی۔

کانگریس کے ساتھ وابستہ رہنے والے بڑے لیڈروں میں مولانا محمد علی جوہر (۱۸۸۹۔۱۹۳۱) کا نام بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہؔر کانگریس سے جس طرح جڑے رہے وہ بھی ایک باب ہے۔ خاص طور سے گاندھی جی نے خلافت تحریک کی جس طرح سے حمایت کی اور پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک فضا بن گئی وہ لائق دید تھی۔

اسی طرح سے محمد علی جناح بھی شروع میں کانگریس سے وابستہ رہے لیکن بعد میں خاص طور سے ۱۹۱۶ء میں کانگریس کے ناگپور اجلاس میں گاندھی جی سے اختلاف کے باعث انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی اور بعد میں وہ مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے اور پاکستان کے قائداعظم کے نام سے معروف ہوئے۔ پاکستان انہی کی قیادت میں آزادی سے ہمکنار ہوا۔

دیو بند تحریک برصغیر کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ علماء کی جماعتوں نے جس طرح ہندوستان میں دینی علوم کو بچانے کی کوششیں کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی جو دارالعلوم کے بانی ہیں۔ دارالعلوم کے فارغین انہیں کی نسبت سے قاسمی کہلاتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء میں ڈالی گئی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا مملوک علی نانوتوی کے جو دہلی کالج کے مدرس ہو گئے تھے شاگرد تھے۔ ان کے اہم شاگردوں میں سرسید احمد خاں علی گڑھ کالج کے بانی، رشید احمد گنگوہی سرپرست دارالعلوم دیوبند اور مولانا احمد علی محدث سہارنپور اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے صاحب علم وفضل شامل ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی حیثیت مناظروں کی وجہ سے تھی۔ اس زمانے میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے مذہبی معاملے میں مناظرے ہوتے تھے۔ اسی عہد میں قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں مدرسہ قائم ہوا تھا۔ آپ وہاں گئے اور مدرسے کی سرپرستی شروع کردی۔ ان دنوں پادری اسلام کے خلاف جابجا تقریریں کرتے تھے۔ منصور علی دہلوی کے سوائے کوئی

ان تقریروں کا جواب دینے والا نہیں تھا۔ منصور علی دہلوی کو انجیل تقریباً زبانی یاد تھی۔ ایک دفعہ ۱۲۹۳ھ میں ضلع شاہجہاں پور کے ایک تعلقہ دار نے ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک مباحثے کا انتظام کیا۔ جس میں انہوں نے ابطال تثلیث وشرک اور اثبات توحید پر گفتگو کی۔ جس کی وجہ سے آپ ہر چہار جانب مشہور ہو گئے۔ مولانا قاسمی کو زیادہ جینا نصیب نہیں ہوا بلکہ وہ پچاس سے کم عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

شیخ محمد اکرام موجِ کوثر میں رقمطراز ہیں کہ

''مولانا محمد قاسم مدرسہ دیوبند کے اصل بانی نہ تھے، لیکن مدرسہ کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ جن قابل عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا۔ شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا، جو جامع مسجد کی سہ دریوں میں بھی جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند تر رکھا اور مدرسے کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر دارالعلوم کی عالیشان عمارت تعمیر ہو سکی۔'' (۷)

دارالعلوم کا ابتدائی ضابطہ اخلاق آپ نے ہی مرتب کیا تھا۔ علی گڑھ بھی اسی زمانے میں قائم ہوا تھا، جس کا مقصد مسلمانوں کی دنیوی پستی کو دور کرنا اور انہیں جدید تعلیم سے روشناس کرنا تھا جس سے کہ وہ دوسری ہم وطن قوموں سے پیچھے نہ رہیں لیکن دیوبند کے مقاصد ٹھیک اس کے برعکس تھے مولانا نے جو اصول مسلمانوں کے دینی مدرسے کے لئے مرتب کئے ان میں روحانی مصلحتوں کو مادی مصلحتوں پر ترجیح دی گئی تھی۔ ان کا بنیادی اصول بقول شیخ محمد اکرام کے جو موجِ کوثر میں رقمطراز ہیں:

''اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں۔ جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ۔ تو پھر یوں نظر آتا

ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا
رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ کارکنوں میں باہم
نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی
بے سروسامانی ملحوظ رہے۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت
بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔(۸)

مدرسہ دارالعلوم کو سب سے زیادہ تقویت اس وقت ملی جب مولانا رشید احمد گنگوہی کے بعد مولانا محمود الحسن دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے۔ یہ وہی شیخ الہند مولانا محمود الحسن ہیں، جن کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے پروقار ادارہ کی بنیاد پڑی۔ وہ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے وہ مدرس اور اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں صدر مدرس ہوئے اور ۳۳ سالوں تک صدر مدرس کی حیثیت سے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

ان کے عہد میں ایک خاص بات اور ہوئی کہ سرسید کے علی گڑھ کالج اور دیوبند کے درمیان جو اختلافات تھے وہ ان کے زمانے میں کم ہوئے۔ دیوبند اور علی گڑھ کے بانیوں کا آخری سرچشمہ فیض ایک تھا وہ شاہ ولی اللہ کے خاندان کی تعلیم تھی۔ ان دونوں کے درمیان مقاصد اور طریقہ کار کا فرق تھا۔ ایک دنیوی ترقی کے ذریعہ مسلمانوں کا عروج چاہتا تھا اور دوسرے کا مقصد دینوی تعلیمات کے ذریعہ مسلمانوں کو اس تنزل سے نکالنے چاہتے تھے۔ سرسید کی بنیادی خواہش تھی کہ علما جو مسلمانوں کی سیاسی برتری اور حکومت کے سائے میں صدیوں سے علم دین کا کام کرتے چلے آرہے تھے ان کی خواہش تھی کہ وہ سیاسی چھتری پھر وہ علماء کو میسر آجائے جس کے سائے تلے وہ دین کا کام بحسن وخوبی انجام دیتے رہیں۔

مولانا محمود الحسن کو سرسید سے کم اختلاف نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتے تھے کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں خواہ کچھ بھی لکھا ہو لیکن علی گڑھ میں مذہب اور دینیات کا شعبہ تو ارباب دیوبند کے سپرد ہے۔ جو صاحب اس زمانے میں ناظم دینیات تھے وہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد اور مولانا مملوک علی کے نواسے تھے۔ اس طرح وہ اس بات سے پوری طرح مطمئن تھے۔ اسی طرح شیخ الہند اس بات کا

پوری طرح ادراک رکھتے تھے کہ ان کے ہم خیال لوگ اسکولوں اور کالجوں میں بھی اسی طرح ہیں، جس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں ہیں۔ اس لئے آپ نے ان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے موقع پر جو تقریر کی وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ واضح رہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پڑی۔ ان کی تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اُس درد کے غمخوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیو بند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔''(۹)

شیخ محمد اکرام مزید رقمطراز ہیں کہ:

> ''شیخ الہند نے اس سلسلے میں پہلا قدم جو اٹھایا وہ ۱۹۰۶ء میں جمعیت الانصار کا قیام تھا۔ جس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا کہ انگریزی خواندہ طلبہ جو تبلیغ کا شوق رکھیں وہ دارالعلوم دیو بند میں جاکر اسلامی علوم حاصل کریں۔ دارالعلوم اس کا خاص انتظام کرے گی۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبہ کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گی جو دارالعلوم دیو بند سے فارغ ہوکر علی گڑھ کالج جائیں گے۔''(۱۰)

ریشمی رومال تحریک کے نام سے مشہور ہونے والے واقعہ کے اصل ہیرو دراصل شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس سلسلے میں وہ ملک سے باہر چلے گئے اور ریشمی رومال تحریک کی ناکامی کے بعد شیخ الہند گرفتار ہوکر مالٹا میں اسیر ہوئے اس کے بعد وہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان لوٹے

لیکن ان کے ہندوستان سے غیر حاضری کی وجہ سے علی گڑھ اور دیوبند کا جو رشتہ انہوں نے قائم کیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور وہ غلط فہمی عود کر آئی جو ان کی کوششوں سے ختم ہوگئی تھی یا بہت حد تک کم ہوگئی تھی۔ جب ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند ہندوستان آئے تو وہ دق کے مریض تھے وہ اسی سال ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کے دہلی میں واقع مکان پر انتقال کر گئے اور ان کی تدفین دیوبند میں عمل آئی۔

برصغیر کی تاریخ میں خلافت تحریک کو ایک غیر معمولی مقام حاصل ہے۔ خلافت تحریک کا اصل محرک یہ ہے کہ جب اتحادیوں نے پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ اور اس کے اتحادی جرمنی کو شکست سے دوچار کیا اور اتحادی فوجیں خلافت کے اصل مرکز استنبول میں داخل ہوئیں تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برطانیہ اور اس کے حلیف ممالک ترکی کو مختلف حصوں میں بانٹ کر اپنی نوآبادی بنالیں گے اور خلافت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں گے۔ اس چیز کو محسوس کرتے ہوئے ہندوستان کے دو جلیل القدر رہنما مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے خلافت کی بقا کے لئے پورے ہندوستان میں تحریک شروع کی اور اس تحریک میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ کانگریس اس تحریک میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ تھی۔ یہ اتحاد دیکھنے کے قابل تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسا اتحاد ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے گا۔ لیکن جب ترکوں نے خود ہی خلافت کا خاتمہ کر دیا تو وہ تمام اتحاد بھی قصہ پارینہ بن گیا۔

جدید سامراجیت کا دور تقریباً ۱۵۰۰ سے شروع ہوا اس سے پہلے یورپ ایک پسماندہ براعظم تھا۔ معاشی زندگی جیسے جیسے ترقی کرنے لگی تجارت بڑھنے لگی تو باہر کی منڈیوں کی ضرورت میں اضافہ ہوا، پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۶۔۱۰۹۹) کی وجہ سے پہلی مرتبہ یورپ کا مشرق سے ربط قائم ہوا بلکہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ جنگیں لڑی ہی اس لئے گئیں کہ یورپ کے لئے تجارتی منڈیاں حاصل کی جائیں۔ شروع میں یہ تجارت اٹلی کے شہری ریاستوں کے ہاتھوں میں رہی۔

اسی زمانے میں ان ملکوں نے بحیرہ روم کو پار کر کے افریقہ سے بھی تجارتی تعلقات قائم کئے۔ تجارت اور نوآبادیات کے دوڑ میں پرتگال سب سے آگے تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ اس کا سمندری

ساحل بہت لمبا تھا اور پڑوس کے علاقوں میں اس کا پھیلنا ممکن نہیں تھا۔ حالات نے اسے مجبور کیا کہ وہ سمندری راستوں سے نئے علاقوں کی تلاش کرے۔ چنانچہ پہلی منزل میں اس نے افریقہ کے مغربی ساحل کے علاقوں اور جزیروں پر اپنا اثر قائم کرنا شروع کیا۔ ۱۴۹۸ میں واسکوڈی گاما افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچ گیا اور وہاں سے واپسی پر مسالوں سے ایک جہاز بھر کر لے آیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان آنے جانے کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

۱۵۰۵ میں مینویل کی حکومت نے ایک نئی پالیسی کی ابتداء کی۔ اب اس سمندری سفر کا مقصد صرف تجارت ہی نہیں تھا بلکہ فتوحات کو بھی اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ ۱۵۰۵ اور ۱۵۱۵ کے درمیان مشرقی افریقہ کے ساحل کے بھی کئی علاقے پرتگال کے زیر اثر آئے۔ ہندوستان کے ایک علاقے دیپ پر بھی قبضہ ہوگیا اور اس نے تجارت کے اس پورے راستے پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ ۱۵۱۰ میں پرتگالیوں نے گوا پر قبضہ کرلیا جسے بعد میں پرتگال کے مشرق کے مقبوضات کا صدر مقام بنادیا گیا۔ ایران کی بندرگاہ ہرمز پر ان کا قبضہ ہوگیا اور خلیج فارس پر اس کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ فتوحات کا یہ سلسلہ سیام تک ہوتا ہوا چین میں کنٹن تک جاری رہا۔ کچھ پرتگالی جاپان بھی پہنچے لیکن جاپانی حکومت نے ان کے قدم نہیں جمنے دیئے۔

اس طرح یوروپ نے ایک کے بعد ایک علاقوں کو تجارت کے بہانے اور پھر اس پر مستقبل قبضہ کرنے کی کوشش شروع کردی اور اپنی نو استعماریت قائم کرتے چلے گئے۔ شروع میں اسپین اور پرتگال ہی تجارت اور نو استعماریت میں آگے آگے تھے لیکن بعد میں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی نے بھی اپنی قسمت آزمائی شروع کی وہ بھی نئے نئے علاقوں کی کھوج میں لوگوں کو روانہ کرنے لگے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اپنے مفاد کے لئے وہ آپس میں بھی ٹکرانے لگتے۔ جس زمانے میں یوروپ کے ممالک دنیا کے مختلف علاقوں میں اپنی نو استعماریت قائم کررہے تھے اور اپنی فوجی طاقتوں میں اضافہ کررہے تھے ٹھیک اسی وقت پوری دنیا کے قلب میں خلافت عثمانیہ کی شکل میں مسلمانوں کی ایک طاقتور سلطنت قائم کی تھی۔ جس کی حدود مشرقی یوروپ افریقہ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایران میں صفوی حکومت قائم کی تھی اور برصغیر میں مغل ایک عظیم سلطنت کے مالک تھے۔ یوروپ کی نو استعماریت سے دنیا

کا کوئی بھی خطہ محفوظ نہیں تھا خواہ لاطینی امریکہ ہو یا جنوبی امریکہ۔ دنیا کے ہر خطے میں ان کی استعماریت قائم ہوگئی۔ جب یورپ نے دنیا کے مختلف علاقوں میں اپنی نو استعماریت قائم کرلی بالآخر وہ عالم اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد یورپ کا عالم اسلام سے براہ راست ٹکراؤ شروع ہوا۔ شروع میں کبھی عالم یورپ حاوی ہوتا اور کبھی عالم اسلام حاوی ہوتا لیکن ۱۶۹۹ء میں معاہدہ کارلووٹز کے بعد ترکی کو یورپ کے کچھ علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا اس کے بعد ترک کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ ترک دھیرے دھیرے شکست کھاتے چلے گئے ایک کے بعد ایک علاقے ان کے ہاتھوں سے نکلنے شروع ہوگئے کبھی مصران کے ہاتھوں سے چلا گیا، کبھی لیبیا اٹلی کے ہاتھوں میں چلا گیا شام فرانس کے ہاتھوں میں چلا گیا اور فلسطین برطانیہ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ لیکن ترکی مغل کی طرح اتنے کمزور واقع نہیں ہوئے تھے انہوں نے ہر ہر قدم پر مقابلہ کیا اور آخری وقت تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کردیا اور سال بھر کے اندر پورے علاقے پر قابض ہوگیا۔ اٹلی نے اس جنگ کے دوران رہوڈس اور بحیرہ ایجن کے کئی جزیروں پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد جنگ بلقان (۱۹۱۲۔۱۹۱۳ء) چھڑ گئی جس میں یونان، سرویا اور بلغاریہ نے ترکوں کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا اور مغربی حکومتوں نے ان کی پشت پناہی کی۔ اس جنگ کے نتیجے میں استنبول سے ادرنہ تک کے علاقے کو چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ کے سارے یورپی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے۔

جنگ بلقان ختم ہوئی تو ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول (۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء) چھڑ گئی جس میں عثمانی ترک جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ اس جنگ میں ترکوں نے اتحادی قوتوں کا جو روس، برطانیہ اور فرانس پر مشتمل تھیں، چار سال تک بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا اور درہ دانیال، قفقاز اور عراق کے محاذوں پر دشمنوں کو کئی بار شکست دی، لیکن جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ترکوں کو بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ کو جنگ بند ہوگئی۔ ۱۲ جنوری ۱۹۲۰ء کو عثمانی پارلیمنٹ کا آخری اجلاس ہوا اور ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہوگئیں۔ ساڑھے چار سو سال کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے دارالحکومت پر غیروں کا قبضہ ہوا تھا۔ اس واقعہ نے نہ صرف ترکی بلکہ ساری اسلامی

دنیا کو غم وغصہ میں مبتلا کر دیا۔ خلیفہ اسلام اب انگریزوں کے بس میں تھا۔ اتحادی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کر دینا چاہتی تھیں، لیکن اس دوران میں اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۲۲ کے آخر تک ترکوں نے تمام دشمنوں کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا۔ سلطان وحید الدین جس کو انگریزوں نے اپنے تسلط کے دور میں بادشاہ مقرر کیا تھا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ایک برطانوی جہاز میں فرار ہو گیا۔ قوم پرستوں نے اس کی جگہ عبدالمجید کو خلیفہ مقرر کیا، لیکن ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ کو بادشاہت ختم کر کے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا گیا اور ۳ مارچ ۱۹۲۴ کو خلافت بھی ختم کر دی گئی۔ اس طرح عثمانی سلطنت کا ۶۲۵ سال بعد خاتمہ ہو گیا۔ اسلامی تاریخ میں کسی مسلمان خاندان نے اتنے طویل عرصے تک حکومت نہیں کی۔

روس کا انقلاب انسانی تاریخ کا ایک بڑا انقلاب ہے۔ اس انقلاب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس انقلاب کو برپا کرنے والے محنت کش تھے۔ یہ انقلاب اشتراکی فکر پر مبنی تھا۔ ۱۹۱۷ میں روس میں آئے عوامی انقلاب کو مغربی دنیا نے تسلیم نہیں کیا بہت بعد میں سب سے پہلے ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ کو جرمنی نے سوویت حکومت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد دوسری حکومتوں نے اسے تسلیم کرنا شروع کیا۔ امریکہ نے ۱۹۳۳ میں اسے تسلیم کیا۔ اس سے پہلے سوویت روس کا مغربی طاقتوں نے زبردست معاشی مقاطعہ کیے رکھا جب سوویت روس نے ہر شعبے میں خود انحصاری کے تحت صورتحال پر قابو پا لیا تب مغربی طاقتوں نے سوویت روس کو سرکاری طور سے تسلیم کیا۔

۱۹۳۰ اور اس کے بعد مغربی دنیا سخت معاشی بحران کا شکار ہو گئی۔ دوسری طرف سوویت یونین نے ایک اہم اور پائیدار اور معاشی طور پر مضبوط حکومت کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ جرمنی فاشزم کے جھنڈے تلے مسلح ہو رہا تھا۔ جس سے برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ فرانس اور اسپین وغیرہ میں اور وہاں کی سیاسی زندگی میں کمیونسٹ پارٹیوں کا اثر بڑھ رہا تھا اس لئے اب سوویت یونین کو الگ تھلگ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ میں امریکہ سوویت یونین کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۴ میں سوویت یونین جمعیت اقوام (League of Nation) کا رکن بن گیا۔

ایشیا میں جاپان کے اچانک ابھرنے سے مغربی دنیا خود حیرت میں پڑ گئی۔ دنیا میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے کہ ایک قوم صرف تیس سال کی مختصر مدت میں دنیا کی طاقتور قوموں میں اپنی شمولیت کو یقینی بنا سکے۔ ۱۸۶۶ء تک جاپان کا شمار زمانہ وسطی کے ملکوں میں ہوتا تھا لیکن ۱۸۹۹ء میں جاپان کے لوگ مکمل طور پر مغربی رنگ میں رنگ گئے اور اپنے آپ کو یورپ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ طاقتوں کی سطح پر لے آئے۔

جنگ چین اور جاپان (۱۸۹۴۔۱۸۹۵ء) میں لڑی گئی۔ اس جنگ نے دنیا میں جاپانیوں کی طاقت کی دھاک بیٹھا دی۔ جاپان نے نہ صرف صنعتی ترقی میں یورپ کی تقلید کی بلکہ علاقائی توسیع پسندی کی پالیسی کو بھی اپنایا۔ ان کی نئی صنعتیں اسے مجبور کر رہی تھیں کہ خام پیداوار اور منڈیوں کے لئے دوسرے ملکوں کی طرف نظر دوڑائے۔ چین اور کوریا اس کے سب سے قریبی پڑوسی تھے۔ چین میں تجارت کے مواقع تھے لیکن آبادی بہت گنجان تھی۔ تاہم منچوریا، جس میں چینی مملکت کے شمال مشرقی صوبے شامل تھے، ترقی اور آبادکاری کی کافی گنجائش تھی۔ جاپان نے کوریا اور منچوریا کی طرف للچائی ہوئی نظریں دوڑانی شروع کر دیں۔

جاپان نے معمولی سا بہانہ بنا کر کوریا پر حملہ کر دیا۔ لڑائی میں جو نقصان ہوا تھا اس کا معاوضہ وصول کرنے اور اپنی چند بندرگاہیں جاپانی تجارت کے لئے کھول دینے پر کوریا کو مجبور کیا گیا۔ لیکن جاپان بہت دنوں تک اس سے مطمئن نہیں رہا۔ اس نے چین کو اس پر مجبور کیا کہ کوریا جو چین کے زیر اثر تھا، اب دونوں ملکوں یعنی چین اور جاپان کی باج گذار ریاست بن جائے۔ اس کی وجہ سے ظاہر ہے جھگڑے شروع ہوئے جاپان اسی کا منتظر تھا، چنانچہ ۱۸۹۴ء میں چین پر جنگ مسلط کر دی گئی۔

چین اور جاپان کی یہ جنگ ایک سال تک چلتی رہی لیکن جاپان کے لئے یہ نہایت معمولی واقعہ ثابت ہوئی۔ جاپان کی بری اور بحری افواج عصری تھیں اور چینی فوجیں قدیم اور نااہل۔ جاپان کو ہر قدم پر کامیابی ہوتی رہی اور چین پر ایک ایسا معاہدہ عائد کر دیا گیا جس سے جاپان کو وہی حیثیت حاصل ہوگئی جو چین سے معاہدہ کرنے والی مغربی طاقتوں کو حاصل تھی۔ جاپان کے ہاتھوں چین کی اس زبردست

ہزیمت نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ مشرق بعید میں ایک طاقتور ملک کے عروج سے مغربی طاقتیں خوش نہیں ہوئیں۔ تین بڑی طاقتوں روس، جرمنی، فرانس نے اس بات پر اصرار کیا کہ جاپان نے جن علاقوں کو چین سے زبردستی حاصل کیا تھا ان سے وہ دست بردار ہو جائے، جاپان کے لئے یہ بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ وہ ابھی اتنا طاقتور نہیں تھا۔ ان تینوں کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن جاپان نے اس ذلت کو فراموش نہیں کیا۔ جاپان نے ایک بڑی لڑائی کی تیاری شروع کر دی۔ یہ لڑائی نو سال بعد روس کے ساتھ ہوئی۔

۱۹۰۴ء کی ابتداء میں روس اور جاپان کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ جاپان اس کے لئے پوری طرح تیار تھا اور جاپانی لوگ اپنی حکومت کے پروپیگنڈہ اور شہنشاہ پرستی کے اپنے مسلک کے باعث جوش وخروش کے ساتھ اس میں شریک تھے۔ روس اس کے برخلاف بالکل تیار نہیں تھا۔ یہ جنگ بڑی شدت کے ساتھ ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ غیر معمولی کشت وخون کے بعد بندرگاہ آرتھر دوبارہ جاپانیوں کے قبضے میں آ گیا۔

روس نے جنگی جہازوں کا ایک بڑا بیڑہ یورپ سے طویل راستہ طے کروا کے مشرق بعید کی طرف روانہ کیا تھا لیکن دنیا کا نصف حصہ طے کر کے اور ہزاروں میل کے سمندری سفر کے بعد یہ عظیم الشان بیڑا جب بحر جاپان میں پہنچا تو جاپان اور کوریا کے درمیان واقع تنگ آبنائے توشیما میں جاپانیوں نے اسے اس کے امیر البحر کے ساتھ غرق کر دیا۔ اس تباہ کن شکست نے روس کے عوام میں غصہ کی لہر دوڑا دی اور ساری دنیا میں جاپان کی دھاک بیٹھ گئی۔

یہ وہ سیاسی پس منظر تھا جس میں اقبال نے پرورش پائی تھی۔ جس چیز کو اقبال نے قریب سے بذات خود مشاہدہ کیا تھا۔ خاص طور سے مسلمانوں کی زبوں حالی جس میں امت مسلمہ گرفتار کر دی گئی تھی۔ مسلمانوں کے سیاسی استحکام نے بہت ساری اخلاقی اور سماجی برائیوں کو پردے میں چھپائے رکھا تھا۔ جب مسلمانوں کا سیاسی زوال ہو گیا تو اس امت کی تمام اخلاقی اور سماجی خرابیاں سامنے کھل کر آ گئیں جس کی وجہ سے اقبال کا ذہن قومیت سے ملت کی بھلائی کی طرف مڑ گیا۔ اقبال پھر اس عظمت رفتہ کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

اقبال کی سیاسی وابستگی

یورپ سے لوٹنے کے بعد اقبالؔ کے نظریات میں واضح تبدیلی واقع ہوئی۔ انہوں نے قومیت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ انہوں نے صرف امت مسلمہ کے کاز کے لئے اور اس کی بھلائی کے لئے آگے کا لائحہ عمل بنایا۔ حالانکہ اس کاز کے لئے ان کو اپنے کئی ہمدردوں سے بھی شدید اختلافات ہوئے لیکن انہوں نے اپنے مقصد کو پس پشت نہ ڈالا۔

مولانا محمد علی جوہر سے بھی اختلاف کی یہی بنیاد تھی اور مسٹر محمد علی جناح سے بھی وہ نالاں دیکھائی پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کل ہند سطح پر اتحاد کی کسی بھی کوشش کی حوصلہ افزائی نہیں کی جب تک ان دو شرائط کی تکمیل نہ ہو جائے۔ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت والی حکومت قائم ہو جائے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے علیحدہ حلقہ انتخاب کی اجازت دی جائے۔ ان مسائل پر جناح کے ساتھ ان کا تصادم ہوا۔ لیکن بعد میں جناح مشترکہ حلقہ انتخاب پر رضامند ہو گئے جس کے تحت پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں جو ۵۰ فیصد سے کم نہ ہو۔ اقبال اس قدر برہم تھے کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر جناح مسلمانوں کے مفادات کے ساتھ غداری کرنے کے سلسلے میں معافی بھی طلب کریں تب بھی مسلمانوں کو انہیں بخشنا نہیں چاہیے۔ اس سے قبل ۱۹ جولائی ۱۹۲۷ کو پنجاب قانون ساز کونسل میں تقریر کرتے ہوئے برطانوی سرکاری ملازمین کی زبردست ستائش کی۔ جس پر مولانا محمد علی جوہر ناراض ہو گئے۔ اقبال نے کہا تھا کہ اس کے بجائے کہ ہندو مسلمان افسران کی تعداد بڑھا دی جائے وہ انگریز افسران کی تعداد میں اضافے کا خیر مقدم کریں گے۔ بہت سے ممبران نے احتجاج میں اپنی آواز بلند کی لیکن اقبال اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ انہوں نے معترضین سے کہا کہ انہیں اب ان کی طرح متحدہ قومیت سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

انہوں نے پنجاب اسمبلی میں کہا تھا کہ

''یہ لفظ اس ملک کے عوام کے ہونٹوں پر گذشتہ پچاس سال سے جاری ہے، لیکن ایک مرغی کی طرح اس نے شور تو بہت مچایا لیکن ایک انڈا ابھی نہیں دیا۔'' انہوں نے کہا کہ پنجاب میں ۱۹۲۲ سے ۱۹۲۷ تک چودہ خونریز فسادات ہوئے اور صوبے میں خانہ جنگی جیسی کیفیت پیدا ہوگئی۔''

مولانا محمد علی جوہر جو اس وقت انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم کا ایک مشترکہ محاذ قائم کیے جانے کے زبردست حامی تھے اور اپنے اردو رسالہ ''ہمدرد'' کے ۱۴ دسمبر ۱۹۲۷ کے شمارے میں ''اقبال میرا معلم'' کے عنوان سے ایک مضمون میں اقبال کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے لکھا کہ

''پہلی جنگ عظیم کے دوران جب ہم کراچی کے جیل میں سڑ رہے تھے اقبال آزاد تھے۔ حکومت نے جنگ ختم ہونے کے بعد ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ انگریزوں نے پنجاب کے کئی اہم رہنماؤں سمیت سینکڑوں افراد کو گرفتار کر لیا لیکن اقبال علیحدہ رہے۔ مولانا نے اس بات کا تفصیلی تذکرہ کیا کہ اقبال نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر تحریک خلاف میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک فتوی جاری کیا جائے۔ مولانا نے ۵۰۰ سے زائد مولویوں کی جانب سے فتوی جاری کرا دیا۔ اس پر اقبال یہ کہہ کر دستبردار ہوگئے کہ وہ تعمیری کام کو ترجیح دیتے ہیں اور مسلمانوں کو تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ محمد علی نے شکوہ کیا کہ ہزار افسوس کی بات ہے کہ اقبال مسلمانوں کے لئے تکنالوجی کی باتیں کرتے ہوئے اور اپنی عظیم تخلیقات پیش کرتے ہوئے انارکلی میں اپنی رہائش اختیار کر لی۔ جبکہ ہم غریب، ان تخلیقات کی پروردہ مختلف برطانوی جیلوں میں سڑتے رہے۔''

مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال دونوں نے اپنی فکری بصیرت کی بنیاد پر اپنے اپنے فیصلے پر قائم

رہے۔ آئندہ کے واقعات نے اس بات کو صحیح ثابت کر دیا کہ اقبال کا جو مؤقف ہے وہ درست تھا۔ جیسے خلافت کے مسئلہ پر محمد علی جوہر اور اقبال کی بصیرت میں بعد المشرقین والی کیفیت تھی۔ اقبال خلافت کے تعلق سے اپنی رائے ''دریوزہ خلافت'' کے عنوان سے ایک نظم میں دے چکے تھے۔ وہ نظم یہ ہے۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بیوفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگاہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

دریں اثنا مولانا کے ساتھ اقبال کے تعلقات مزید خراب ہو گئے۔ خصوصاً اس وقت جب اقبال نے سر محمد شفیع کے ساتھ اس طرح مفاہمت کر لی کہ انہوں نے سارے سفید فام ممبران پر مشتمل سائمن کمیشن کا کھلم کھلا استقبال کیا۔ بلکہ لیگ کانگریس اور خلافت کے ممبران کی جانب سے اس کمیشن کا بائیکاٹ کئے جانے کی مخالفت بھی کی۔ مولانا نے اقبال کو لاہور یا کسی دوسرے مقام پر ان کے ساتھ ایک عوامی جلسہ میں تقریر کرنے کی دعوت دی، تاکہ اقبال خود اپنے طور پر یہ معلوم کر سکیں کہ مسلمان کس کے حامی ہیں۔

انہوں نے اقبال سے کہا کہ ''عوام کو فیصلہ کرنے دیجئے۔'' اقبال نے یہ پیشکش یہ کہتے ہوئے نامنظور کر دی کہ ''وہ کرتب بازی میں یقین نہیں رکھتے۔''

علامہ اقبال نے سائمن کمیشن کا استقبال کیوں کیا دراں حالانکہ کے ان کے تمام ممبران انگریزوں پر مشتمل تھے۔ اس کی وجہ اقبال کے ذہن میں یہ تھی کہ اگر اس کمیشن کے ممبران میں کوئی ہندو یا مسلم ممبران

داخل ہو جاتا تو وہ ایک دوسرے کے مفادات کو زک پہنچانے کی کوشش کرتے اور زیادہ سے زیادہ فوائد اپنی قوم کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرتے اس لئے علامہ اقبال کی یہ رائے بالکل درست تھی کہ خالص انگریزوں پر مشتمل کمیشن ہی غیر جانبدارانہ طریقے سے کوئی فیصلہ کرسکتی ہے۔ اس لئے اس کمیشن کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے۔ آنے والے وقت نے اقبال کی بصیرت کو درست ثابت کر دیا۔

علامہ اقبال کی مرتے دم تک یہی خواہش تھی کہ مسلمان زندگی کے ہر شعبے حیات میں اسی طرح بام عروج پر پہنچ جائیں جس طرح یورپ نے اپنی علمی پیش رفت سے ایک جہاں کو تسخیر کرلیا کہ ساری دنیا اس کی معترف ہے۔ اس کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان قوم جو صدیوں سے علمی اور فکری جمود کے باعث تحت الثری تک پہنچ چکی ہے وہ پھر اپنی اصل کی طرف لوٹے اقبال کی امت مسلمہ کے لئے تڑپ اظہر من الشمس ہے کہ وہ ہر حال میں امت مسلمہ کی سربلندی کے لئے کوشاں رہے۔ بستر مرگ پر بھی وہ خطوط کے ذریعے اپنے ہمنوا اور امت کے خیر خواہ افراد کو اپنی رائے اور مشورے سے نوازتے رہتے تھے۔ ان کے سینکڑوں خطوط اس بات کے گواہ ہیں کہ جو ان کی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے انہوں نے امت مسلمہ کو جو مفید مشورہ دیئے ہیں یہ صرف انہی کا حصہ ہیں۔

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۳۸ میں اقبال بستر مرگ پر تھے لیکن قومیت کے مسئلہ پر مولانا حسین احمد مدنی کی سخت گرفت کی جس کا ثبوت وہ قطعہ ہے جو ''ارمغان حجاز'' میں جو حسین احمد مدنی کے وطنیت کے نظریہ کے خلاف ہے:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبرز مقام محمد عربیؐ است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ ایں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

☆☆☆

لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کی صدارت

۱۹۳۰ تک دونوں مسلم لیگیں ایک ہو چکی تھیں۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد مطالبات اور مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات دونوں ایک ہی مطلب رکھتے تھے لیکن چونکہ مسلمانوں کی سیاست میں قائد دین کے اس گروہ کی برتری ثابت ہو چکی تھی جو روز اول سے جداگانہ انتخاب کا حامی تھا اور علاوہ بریں علامہ اقبال کئی سال سے مسلم سیاست کی نہایت موثر خدمات انجام دے رہے تھے اس لئے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کے صدر منتخب کئے گئے جو دسمبر ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں منعقد ہونے والا تھا۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے جو خطبہ صدارت دیا وہ خیالات کی وسعت و بلندی لہجے کی صداقت، زبان کی دل فریبی اور مطالب سیاست کی فراوانی کے اعتبار سے بے نظیر دستاویز تھی۔ علامہ اقبال نے اسی خطبہ صدارت میں ایک مسلم ریاست کی تجویز پیش کی تھی۔ اس خطبہ کے الفاظ یہ تھے:

> ''مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی نہایت شدومد سے تائید کرے گا جو اس قرارداد میں موجود ہیں (آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرارداد)۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا باہر رہ کر۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔'' (۱۱)

اس خطبہ کے اقتباس کی تصدیق مسٹر راغب احسن کو لکھے جانے والے اس خط سے ہوتی ہے جو اقبال نے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ کو راغب احسن کو لکھا تھا:

ڈیر راغب صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ کانفرنس کی صدارت سے مجھے سبکدوشی ہوئی۔ اس کے اندرون حالات افسوسناک ہیں اور اگر مجھے ان کا علم ہوتا تو میں اس کی صدارت قبول نہ کرتا۔ بہر خدا کا شکر ہے کہ یہ زمانہ صدارت ختم ہوا۔ جمعیت العلماء کا بھی حال ایسا ہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے کہا تھا لیکن میں نے انکار کردیا۔ اصرار پر بھی انکار ہی رہا۔ رہا علماء کے اختلافات کی وجہ سے محکمہ قضا اور علماء کی اسمبلی کا خیال مجھے اندیشہ ہے کہ محض خیال ہی رہے گا۔ ایک وقت تھا (سروا ایکٹ کے ایجی ٹیشن کے زمانے میں) کہ گورنمنٹ ہند خود اس تجویز کے لئے تیار تھی۔ میں نے مولوی کفایت اللہ صاحب کو لکھا بھی مگر انہوں نے توجہ نہیں فرمائی۔ جو کچھ میرے خیال میں ہے وہ تو فی الحال صرف اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کے لئے علماء کی ایک اسمبلی بنائی جائے جس کا فرض یہ ہو کہ کوئی قانون جس کا تعلق مسلمانوں کے پرسنل لا سے ہو، مرکزی اسمبلی میں وضع نہ کیا جائے جب تک علماء کی اسمبلی اس پر غور نہ کرلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ بعض امور شرعیہ ایسے ہیں کہ ان کا فیصلہ صرف مسلمان قاضی کرسکتا ہے۔ اس واسطے مسلمان سب جج خاص اس مطلب کے لئے مقرر کئے جائیں اور ہائی کورٹ میں سابق کی طرح صدر الصدور ہوا کریں۔ میرے خیال میں موجودہ حالات میں صرف اس قدر ممکن ہے کہ اگر مسلمان جدوجہد کریں۔ جو کچھ آپ کے خیال میں ہے۔ اس کا پورا ہونا بہت سے نئے حالات واسباب پر منحصر ہے۔ جن میں سب سے بڑا

ضروری امر یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست پیدا کی جائے یا پاکستان کی اسکیم بروئے کار آئے۔ ان اسکیموں کے ہوتے ہوئے بھی کامل شرعی آزادی حاصل کرنے کے لئے مزید جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ بہت حد تک ان تمام باتوں کا دارومدار علماء کے اتحاد پر ہے مگر ان کا اختلاف عامۃ المسلمین سے بھی زیادہ ہے اور ان کا وجود اس وقت (خاص کر ان کا جو پالیٹیشین ہوگئے ہیں) منصب پرست مسلمانوں سے زیادہ مضر ہے۔ بہر حال میں نے شفیع داؤدی اور سید ذاکر علی صاحب کو لکھا ہے کہ وہ علماء کی ایک عالمگیر کانفرنس کے لئے کوشش کریں۔ ابھی وقت ہے اس کانفرنس کا کام ہوگا کہ اوروں کے مشورہ سے ایک خاص اسکیم تیار کرے۔ ابھی تک خاص اسکیم کسی کے ذہن میں نہیں ہے، اکثر علماء کو بھی معلوم نہیں کیونکہ یہ کام ہر عالم کا نہیں ہے۔ میں نے کوئی میمورنڈم نہیں لکھا ہاں جس امر میں مشورہ طلب کیا گیا اس میں میں نے مشورہ ضرور دیا۔ فقط

محمد اقبال (۱۲)

اس خط سے بہت ساری باتوں کے علاوہ علامہ اقبال کے خطبہ صدارت الہ آباد کے تصور پاکستان کی تصدیق ہوتی ہے اس لئے کہ اس خط میں براہ راست پاکستان کا ذکر واضح انداز میں ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی سیاسی وابستگی خالص مسلمانوں کے کاز کے لئے تھی اور اس میں خاصے کامیاب رہے۔

☆☆☆

کتابیات

(۱)حیات جاوید: مولانا الطاف حسین حالی، صفحہ:

(۲)موج کوثر: از شیخ محمد اکرام، صفحہ:۸۷

ناشر: فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹیڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

(۳)موج کوثر، شیخ محمد اکرام، صفحہ:۸۷

(۴)آزاد کی تقریر، صفحہ:۲۰۴

(۵)موج کوثر: از شیخ محمد اکرام، صفحہ:۲۹

ناشر: فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹیڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

(۶)ایضاً، صفحہ:۱۲۴۔۱۲۵

(۷)ایضاً، صفحہ:۲۰۰

(۸)ایضاً، صفحہ:۲۰۰۔۲۰۱

(۹)ایضاً، صفحہ:۲۰۳

(۱۰)ایضاً، صفحہ:۲۰۳

(۱۱)ذکر اقبال، از: عبدالمجید سالک، صفحہ:۵۱

ناشر: بزم اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور

(۱۲)اقبال۔ جہان دیگر از: محمد فرید الحق، صفحہ:۴۹۔۵۱،

ناشر: 326/1 محلہ اسلام گنج، لسبیلہ ژوک، نشتر روڈ، کراچی

☆☆☆

باب نمبر دوم

اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار

پہلا دور

وطن سے اقبال کی محبت کا اولین اور شاید موثر ترین مظاہرہ ''ہمالہ'' میں نظر آتا ہے۔ یہی بانگ درا کی پہلی نظم ہے اور جذبات، نیز شاعرانہ تخیل کے اعتبار سے ہمالہ پہاڑ سے کم بلند نہیں۔ بانگ درا کا پہلا اڈیشن جب ۱۹۲۴ میں شائع ہوا تو اقبال کی شاعری ملی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ لیکن ان کی نظروں میں اس نظم کی اہمیت اور قدر و قیمت کم نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اسی بنا پر انہوں نے بانگ درا میں اسی کو پہلی جگہ دی۔

اس کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشان
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیان

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

امتحان دیدہ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندوستان ہے تو

مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو، وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوتِ گاہِ دل دامن کش انسان ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہر عالم تاب پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انسان جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازہ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھادے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اسی سلسلے کی ایک اور نظم ''تصویر درد'' ہے جس میں ملک کی حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اہل وطن کو اقبال نے خبردار کیا ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے گیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنا دلِ باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے! ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر!
زمین پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والوں!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

اقبال کی ابتدائی دو نظموں کے بعد ایک اہم نظم "صدائے درد" ہے جس میں اس دور کے ہندوستان کی حالت کا نہایت موثر نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کا ابتدائی حصہ درج ذیل ہے۔

جل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سر زمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موج و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

قومی شاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت بنانے والی نظموں میں ان کا ''ترانہ ہندی'' خصوصیت کا حامل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں، اس کی، وہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا
یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ہندوستان میں اس گیت کو قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی درمیانی شب کے بارہ بجے جب ہندوستان کی غلامی کے خاتمے کا اور آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس موقع پر ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان میں ''جن گن من'' کے ساتھ اقبال کا ترانہ بھی گایا گیا۔

اس ترانے کے مداحوں میں گاندھی جی بھی تھے، اقبال کی وفات کے بعد ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ

> ''ڈاکٹر اقبال کے بارے میں میں کیا لکھوں۔ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''ہندوستان ہمارا'' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور یرودہ جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔'' (۱)

ایک موقع پر گاندھی جی نے اردو ہندی کی نزاع کے سلسلے میں اس ترانے کو ''ہندوستان کی قومی زبان'' کا نمونہ کہا تھا۔

> ''کون ایسا ہندوستانی دل ہے جو اقبال کا 'ہندوستان ہمارا' سن کر دھڑ کنے نہیں لگتا اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔ اقبال کے اس ترانے کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے؟ یا اردو ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی قومی زبان نہیں ہے۔'' (۲)

آزادی ملنے کے بعد بھی اس ترانے کی یاد گاندھی جی کے دلوں میں باقی رہی۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۷ کو نواکھالی کے ایک گاؤں میں جہاں ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے دوش بدوش لہرا رہے تھے، ان کی پراتھنا سبھا میں یہ ترانا گایا گیا۔ آخر میں گاندھی جی نے ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' دہراتے ہوئے دعا کی تھی کہ اپنے مسائل کو حل کرنے کیلئے اب ہم کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لیں۔

''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' بھی ''ترانہ ہندی'' ہی کی طرح مقبول ہوا۔ اس کا پہلا اور

آخری بند یہ ہیں:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اقبال کی وطن پرستی کا موثر ترین اظہار ''نیا شوالہ'' میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
آپس میں بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیرت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقش دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اٹھ کر گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی کہ

''اقبال کے دور وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے...... شاعر نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لئے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کردیا ہے۔ اکثر ناقدین اقبال کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر یہ اقبال کی بہترین نظم ہے۔ (۳)

اقبال تمبر ۱۹۰۵ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ اس سفر کے وقت اقبال کا جو قومی ذہن تھا، اس کا کچھ اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے، جو وطن سے رخصت ہونے کے بعد اپنے دوست مولوی انشاءاللہ خاں اڈیٹر ''وطن'' کو لکھا تھا اور جو اس زمانے میں شائع بھی ہوگیا تھا۔ قیام بمبئی کے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آ کر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بھی بولتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا 'تم کہاں سے آئے ہو؟ بولا چین سے آیا ہوں، اب ٹرانسوال

جاؤں گا، میں نے پوچھا چین میں تم کیا کام کرتے تھے؟ کہنے لگا کہ سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے؟ میں نے سن کر دل میں کہا کہ ہم ہندوستانیوں سے تو یہ افیمی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو! شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ! ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیاء کی تجارتی عظمت کو از سرِ نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندوستانی خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگال کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔"

مولوی صاحب! میں بے اختیار ہوں! لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا وعظ کرنے۔ کیا کروں! اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات (اس نے) مجھے مجنوں سا کر دیا ہے، اور کر رہا ہے۔"

(۴)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکرِ اقبال" میں رقمطراز ہیں:

"۱۹۰۵ سے پہلے کا اقبال آٹھ دس برس کی قلیل مدت میں تمام اردو داں ہندوستان میں مقبول خاص و عام ہو گیا۔ اس سریع السیر شہرت کے کئی اسباب تھے، ایک یہ کہ غالب کے بعد سے اردو زبان نے کوئی مفکر شاعر پیدا نہ کیا تھا جس میں ہوس کی غزل سرائی اور محض قافیہ بندی اور دور از حقیقت مضمون آفرینی

اور ادنی درجے کے فن برائے فن سے پوری طرح روگردانی کر کے ایک شاعر قلب انسان کی آواز اور فطرت کے دل کی دھڑکن بن گیا ہو اور جس کی طبیعت میں وطن وملت اور انسانی زندگی کے حقیقی اور ابدی مسائل پر سوز اظہار کے لئے بیتاب ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں بیداری، غلامی سے بیزاری اور آزادی کی طلب انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ یہ طلب انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب سے تصادم کا نتیجہ تھی۔ نئے تعلیم یافتہ گروہ نے دیکھا کہ انگریزوں نے اور مغرب کے دیگر اقوام نے حب الوطنی اور وطن پرستی کے جذبے سے ترقی کی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ یہ قومیں آزاد ہیں اور ہم غلام ہیں؟ آؤ ہم بھی وہی جذبہ پیدا کریں اور ان کی طرح آزاد اور ترقی یافتہ صف میں کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس مسئلے کا حل اتنا آسان نہیں تھا، ہندوستان ایک وسیع ملک تھا جس میں مختلف مذاہب رکھنے والے اور مختلف طریق معاشرت پر زندگی بسر کرنے والے ایک دوسرے سے متغائر گروہ اور ملتیں موجود تھیں۔ انگلستان کی طرح یہاں ایک قوم، ایک مذہب اور ایک زبان سے مربوط ومسلک ملت ناپید تھی اور مغرب کے انداز کا وطن کا تصور اور اس کے ساتھ وابستہ جذبہ یہاں تاریخ کے کسی دور میں موجود نہیں تھا۔ مغربی اقوام نے اپنے لئے حل تلاش کیا تھا وہ یہاں قابل اطلاق نہیں تھا۔ یہاں صرف ہندو اور مسلمان ہی دو مختلف العقائد اور مختلف المعاشرت گروہ نہ تھے۔ ہندوؤں میں سیکڑوں مذہبی فرقے موجود تھے اور کوئی عقیدہ بھی ایسا نہ تھا

جو ان سب میں مشترک ہو۔حکومت ہمیشہ اقوام کے تفرقے سے فائدہ اٹھا کر غلامی کا جوا ان کی گردن پر رکھتی رہی ہے۔ انگریزوں کو اس ملک میں تفرقہ اندازی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہاں ہزاروں برس سے انسانی گروہوں کے درمیان ناقابل عبور خلیجیں حائل تھیں، ایسی حالت میں غیر ملکی حکومت اور استحصال کرنے والی ملوکیت سے نجات ہو تو کس طرح ہو۔ آزادی طلب نوجوانوں کی سمجھ میں پہلے یہ بات آئی کہ ہم بھی انگریزوں کی طرح ایک قوم بن جائیں اور تمام ملک کو اپنا وطن قرار دے کر اس کے متعلق جذبہ وطنیت کو ابھاریں، مذہبی اختلافات کو غیر اصل قرار دیا جائے اور وطن کی عظمت کے گیت گائے جائیں تاکہ غیر ملکی حکومت نے جو احساس کمتری پیدا کر دیا ہے اس کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہو۔ پرانے دیوتاؤں کی پوجا کو باطل قرار دے کر وطن کے بڑے بت کی پوجا کی جائے۔ اسی حال اور اسی جذبہ کے تحت نوجوان اقبال کا احساس قلب وطن کے ترانے گانے لگا۔ چونکہ ہندو قوم کا وطن اور اس کا مذہب گوناگونی کے باوجود باہم وابستہ ہیں، اس لئے وطن پرستی کی تحریک ہندوؤں میں مسلمانوں سے قبل پیدا ہوئی، لیکن ہندو قوم کوئی ایسا شاعر نہ پیدا کر سکی جو اس کے اس جذبے کو ابھار سکے اور اس کے قلوب کو گرما سکے۔ ہندو قوم کے پاس وطنیت کا کوئی ترانہ موجود نہیں تھا، اقبال نے جب اسے شاعرانہ کمال کو وطنیت کی خدمت کے لئے وقف کیا تو مسلمانوں کے علاوہ بلکہ ان سے زیادہ ہندو اس سے متاثر ہوئے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ملک کے طول و عرض میں گونجنے لگا، بعض ہندو مدارس میں مدرسہ شروع ہونے سے قبل تمام طالب علم اس کو ایک کورس میں گاتے تھے۔

ہندوستان میں وطنیت کے جذبہ کو جس شاعر نے پہلے گرمایا وہ اقبال با کمال تھا۔ ہندوستان اگر ایک وطن اور ایک قوم بن سکتا تو اقبال کا وطنیت کا کلام اس کے لئے الہامی صحیفہ ہوتا۔''

(۵)

☆☆☆

دوسرا دور

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور سفر یورپ کے بعد ۱۹۰۸ میں وطن لوٹنے کے بعد شروع ہوتا۔ ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ تک یورپ میں اپنی تعلیم کے دوران انہوں نے شاعری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ جب وہ یورپ سے وطن لوٹے تو ان کے اندر ایک بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ وہی اقبال جو ہندوستان سے یورپ جاتے ہوئے وطن کی محبت میں نغمے گاتے تھے اب ملت کی باتیں کرنے لگے۔

۱۹۰۸ سے پہلے وہ یہی سمجھتے تھے کہ مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ مل کر ''متحدہ قومیت'' بنا سکتے یا غیر مسلم اور مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں لیکن انہوں نے قرآن مجید کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو ان پر یہ صداقت واضح ہوگئی کہ مسلمانوں کی قومیت کا سنگ بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ عقیدہ توحید ہے۔

ان کی ایک نظم ''ترانہ ملی'' کے نام سے ہے جو وطنی تصور کے بالکل مخالف ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک وطن ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موجِ دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
لیکن ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
اے ارضِ پاک تیری حرمت پر کٹ مرے ہم
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس کے بعد اقبال کی تمام سیاسی جدوجہد اور نغمہ خوانی مسلم قوم کے لئے وقف ہوگئی اور وہ تاحیات اپنے اس مؤقف پر اٹل رہے۔

آرنلڈ کو اسلام اور تبلیغ اسلام سے بھی شغف تھا۔ اقبال نے طالب علمی ہی کے زمانے میں لندن سے ایک خط میں حسن نظامی کو لکھا تھا:

> ''مسٹر آرنلڈ کا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کے لئے باقاعدہ کوشش نہیں کی اور اب وہ وقت ہے کہ ایسا کیا جائے۔'' (٦)

عتیق صدیقی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> گمان غالب ہے کہ جارحانہ وطن پرستی سے اسلام کی طرف اقبال کی شاعری کا رخ موڑنے میں آرنلڈ کی کوششوں کا

بھی خاصا ہاتھ رہا ہوگا۔ اس سلسلے میں براؤن اور نکلسن جیسے مستشرقین کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں، جو کیمبرج ہی میں استاذ تھے اور جن سے اقبال نے کسب فیض کیا تھا۔ نکلسن نے تو آگے چل کر مثنوی اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپ کو اقبال سے روشناس کرنے کی پہلی کوشش کی، اسی طرح اقبال کے سیاسی ذہن کی تربیت میں نکلسن اور براؤن کے علاوہ سر سید امیر علی کو بھی بڑا دخل تھا، جنہوں نے کلکتہ کی سکونت ترک کر کے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور اس کی تائید اس خیال سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۹۰۸ میں برطانوی رائے عامہ کو مسلم لیگ کے اغراض ومقاصد سے روشناس کرنے اور جداگانہ نیابت کے لئے برطانوی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی غرض سے جب لندن میں مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو سید امیر علی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال بار ایٹ لاء مجلس عاملہ کے ممبر چنے گئے۔ قواعد وضوابط وضع کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی، جس میں سید امیر علی کے ساتھ میجر حسن بلگرامی اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل کئے گئے۔ (۷)

آرنلڈ کی اسلام سے دوستی سے متعلق اقبال کی جو رائے پہلے تھی، وہ بعد میں بدل گئی۔ نذیر نیازی جنہوں نے اقبال کا انٹرویو لیا، کہنا ہے کہ آرنلڈ کے انتقال کی خبر سن کر اقبال کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور پھر سر جھکا کر چند لمحے خوب روئے اور کہا

''اقبال اپنے استاذ اور دوست سے محروم ہو گیا۔''

لیکن جب نذیر نیازی نے آرنلڈ کی اسلام نوازی کا ذکر کیا تو اقبال نے کہا:

''اسلام؟ اسلام سے آرنلڈ کا کیا تعلق؟ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاک انگلستان سے تھی۔ وہی ان کا دین تھا اور وہی ان کی دنیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا انگلستان کے مفاد کے

لئے کیا......۔ آرنلڈ کو مسیحیت سے غرض تھی نہ اسلام سے بلکہ
سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو آرنلڈ کیا ہر مستشرق کا علم وفضل
بھی وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو مغرب کی ہوس استعمار اور
شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان حضرات کو بھی شہنشاہیت
پسندوں اور سیاست کاروں کا دست باز و تصور کرنا چاہئے۔''

سر تھامس آرنلڈ کا اقبال سے یہ کہنا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کے لئے باقاعدہ کوشش نہیں کی اب وہ وقت ہے کہ ایسا کیا جائے اور پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن کا اقبال کے تیئں ہمدردی کا جذبہ اور خاص طور سے پروفیسر نکلسن کے اسرار خودی کا The Secret of the Self کے نام سے ترجمہ کر کے یورپ اور امریکہ میں متعارف کرانا۔ اسرار خودی کی وجہ سے اقبال کو سر کا خطاب ملنا۔ یہ تمام باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اقبال کی جارحانہ وطن پرستی سے خوف محسوس کر رہے تھے، ان کی کوشش تھی کہ وہ اقبال کی جارحانہ وطن پرستی کا رخ موڑ دیں تا کہ وقتی طور سے ہی صحیح سلطنت برطانیہ کے سر سے خطرہ ٹل جائے۔

پروفیسر آرنلڈ سے لے کر پروفیسر نکلسن اور دیگر تمام مستشرقین کے تعلق سے اقبال کی وہ حتمی رائے جو انہوں نے نذیر نیازی کے سوال کے جواب میں دی۔ ان تمام کو اگر ترتیب کے ساتھ یکجا کیا جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام مستشرقین جو دراصل بظاہر اقبال کے خیر خواہ نظر آتے ہیں دراصل اپنی سلطنت اور خاص شہنشاہ برطانیہ کی وفاداری کی کوشش میں اقبال کی شاعری کو وطن پرستی سے اسلام کی طرف موڑنا چاہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کو اقبال کی وطن پرستانہ شاعری سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ برطانیہ نے محسوس کیا کہ اگر جلد از جلد اقبال کی شاعری کو دوسری طرف نہ موڑا گیا تو اقبال کی وطنی شاعری کے باعث ہندوستانیوں کے اندر وطن کی بنیاد پر جو اتحاد ہوگا اس سے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا سورج جلد غروب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے ایک خاص مقصد کے تحت اقبال کی شاعری کو اسلام کی طرف موڑا تا کہ وقتی طور سے برطانیہ کے سر سے خطرہ ٹل جائے۔ حالانکہ اقبال کا اسلام کی طرف دوبارہ راغب ہونا یہ امت مسلمہ کے لئے بہت اچھا ثابت ہوا۔ اس کی

مثال اگر موجودہ سیاسی صورت حال سے دی جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

عراق کا آمر صدام حسین ایران کا کٹر دشمن تھا۔اس نے ایران کے اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کے لئے شط العرب کے مسئلے کو بہانہ بنا کر اور امریکی اور دوسرے عرب ممالک کی حمایت کے بل پر ایران پر آٹھ سالہ جنگ مسلط کردی۔امریکہ نے صدام حسین کی حکومت کا ۲۰۰۳ء میں خاتمہ کر کے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارلی۔امریکی حکومت کا صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ کرنا تھا کہ عراق جو ایک سنی ملک تھا شیعہ آبادی کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ایران سے قریب آ گیا۔جس کی وجہ سے وہ زیادہ طاقت ور ہو گیا۔۲۰۰۶ میں ایران کے حمایت یافتہ جنگجو گروپ حزب اللہ کی اسرائیل سے جنگ ہوئی لیکن اسرائیل اس سے ہار گیا۔اس طرح بڑی طاقتیں وقتی مصلحت کے تحت اور کبھی عظیم طاقت ہونے کے زعم میں ایسی غلطیاں کر بیٹھتی ہیں جو اللہ ان سے کرواتا ہے تا کہ وہ ان ظالم طاقتوں کے زوال کے اسباب پیدا کرے۔

بانگ درا کے حصہ دوم (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸) کی آخری نظم "صقلیہ" ہے اور یورپ سے لوٹتے ہوئے اس وقت کہی گئی تھی جب جہاز جزیرہ سسلی کے سامنے سے گذر رہا تھا۔اس طویل نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
آہ اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کی صحرا میں ہے تو

اسی نظم کا ایک بند یہ ہے:

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسمان نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

عبدالمجید سالک کا یہ بیان درست ہے کہ

> اس دوسرے دور کی نظموں میں ''علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام'' اور ''عبدالقادر'' کے نام سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمالہ، نیا شوالہ، گائتری، میرا وطن وہی ہے کا دور گذر چکا تھا ملکی ترانے کی لے غائب ہوچکی تھی اور اقبال اپنے لئے ایک نیا راستہ چن چکا تھا۔

بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

> ''قیام انگلستان کے دوران ہی میں اقبال کا زاویہ نگاہ وطنیت سے ملت کی طرف پھر گیا...... شیخ عبدالقادر کے نام شعلہ نوائی بھی اسی زمانے کے احساس کی پیداوار ہے۔

درج بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بانگ درا کی آخری غزل اس ولولہ انگیز انقلابی حالت سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے جو ترکی و ایران میں رونما ہو رہے تھے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارہ جنوں تھے وہ بستیوں میں آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

☆☆☆

کتابیات

۱)اقبال: جادونگر ہندی نژاد، از: عتیق صدیقی، صفحہ:۲۶۔۲۷
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔۲۵
(۲)ایضا صفحہ:۲۷
(۳)بانگ درا(شرح)،از: پروفیسر یوسف سلیم چشتی
صفحہ:۲۳۸، ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (پرائیویٹ لمیٹڈ) سرسید احمد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
(۴)اقبال: جادونگر ہندی نژاد، از: عتیق صدیقی، صفحہ:۳۵
(۵)فکر اقبال، از: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، صفحہ:۳۶۔۳۸
ناشر: بزم اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور
(۶)اقبال: جادونگر ہندی نژاد، از: عتیق صدیقی، صفحہ:۵۱
(۷)اقبال: جادونگر ہندی نژاد، از: عتیق صدیقی، صفحہ:۵۱۔۵۲

باب نمبر سوم

اقبال کا ملی تصور

(عالم اسلام کے تناظر میں)

اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں تاریخی واقعات کو بڑا دخل ہے۔ان کا فکری ارتقاء انہیں تاریخی واقعات کی روشنی میں ہوا ہے۔ان کے فکری ارتقاء کو سمجھنے کے لئے تاریخ عالم کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔تاریخ کے مطالعہ کے بغیر آپ اقبال کی شاعری کو کسی بھی صورت میں نہیں سمجھ سکتے۔اقبال کی پوری شاعری تاریخی اعتبار سے ایک پس منظر رکھتی ہے۔اس پس منظر کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔اقبال کو صحیح معنی میں آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب آپ کی نظر یورپ اور عالم اسلام کی تاریخ پر گہری ہو۔

اقبال کی شاعری میں ملی تصور کا آغاز آپ کے سفر یورپ کے بعد یعنی ۱۹۰۸ء سے باضابطہ شروع ہوتا ہے۔جب آپ یورپ میں تھے تبھی آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ یورپ کا جو ظاہری چہرہ ہے وہ کچھ اور ہے اور باطنی چہرہ کچھ اور ہے۔زمانہ قیام یورپ میں ان کی شاعری میں ایک خوش آئند مگر عظیم الشان

انقلاب پیدا ہوگیا۔ انہوں نے مغربی تہذیب وسیاست کو بہت نزدیک سے دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں چیزوں کے مفاسد ان پر بخوبی آشکار ہوگئے اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ قومیت و وطنیت بنی آدم کے حق میں کبھی مفید نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی بنیاد تعصب اور تنگ نظری پر ہے دوسری بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا نتیجہ انسانوں کے حق میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد مادیت اور انکارِ خدا پر ہے۔

اس عرصہ میں انہوں نے اسلامی اصول اور اسلامی تاریخ کا بہت غور کے ساتھ مطالعہ کیا اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا کی نجات اسلامی اصول زندگی کی تبلیغ واشاعت میں مضمر ہے۔

جب انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اپنی شاعری کو اسلامی مقاصد کے حصول کے لئے اور امت مسلمہ کی سربلندی کے لئے وقف کردیں گے تو قدرتی طور پر ان کی شاعری میں ''پیغام'' کا رنگ پیدا ہوگیا۔ جو ۱۹۰۸ سے لے کر ۱۹۳۸ء تک ہر تصنیف اور ہر نظم میں نظر آتا ہے۔

سفر یورپ کے واپسی کے بعد ان کے اندر ایک طرح سے جو تذبذب اور جستجو تھی وہ پوری طرح زائل ہوگئی اور ان کو یقین محکم ہوگیا اور انہوں نے اپنے لئے ایک سمت ڈھونڈ لی کہ اب اپنی خداداد صلاحیت شاعری کے ذریعہ وہ امت مسلمہ کی بھلائی اور امت کے اندر بیداری لانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے یورپ سے جو نظم علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام لکھ کر بھیجی تھی وہ دراصل ان کا پہلا پیغام ہے جو انہوں نے اپنی قوم کی وساطت سے دنیا کو دیا اور غور سے دیکھا جائے تو انہوں نے اپنی زندگی کے باقی ماندہ تیس سال اسی پیغام کی وضاحت میں گذار دیئے۔

چنانچہ مارچ ۱۹۰۷ء میں انہوں ایک نظم لکھی جس کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار ہوگا
سکوت تھا وہ پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارہ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اس کے بعد انہوں نے اپنی قوم کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں اور مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کیا۔ نظم صقلیہ اسی مقصد کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

آہ اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسمان نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستان لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلاؤں گا

بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے وہ فرماتے ہیں:

"جب غیر مسلموں نے اقبال کی شاعری میں یہ انقلاب دیکھا تو انہیں قدرتی طور سے شکایت پیدا ہوئی کیونکہ وہ کب پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص نخچروں کو صیاد کے ارادے سے آگاہ کردے اس غصہ کا اندازہ ان کے ایک ہم وطن

(کشمیری پنڈت) کی نظم سے ہوسکتا ہے، جس کے دو شعر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بندی ہونے میں ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا
محفل میں چھپا ہے قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغام جنوں جو لایا تھا اقبال وہ اب دنیا میں نہیں

ان شعروں کے مطالعہ سے ثابت ہے کہ غیر مسلموں کی نظر میں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں کہ مسلمان حجازی یا نمازی بن جائے۔"(۱)

قیام یورپ کی بدولت اقبال کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا اس کا نقشہ اپنے ایک دوست عبدالقادر کے نام لکھی جانے والی ایک نظم سے ہوتا ہے۔ اس نظم سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اقبال نے اب اپنے لئے ایک نصب العین واضح طور پر متعین کرلیا تھا یعنی خدمت دیں و اسلام۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رخت جاں بتکدہ چیں سے اٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رخ سعدی و سلیٰمی کردیں
دیکھ! یثرب میں ہوا ناقہ لیلیٰ بیکار
قیس کو از روئے نو سے شناسا کردیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کردیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ
چیر کہ سینہ اسے وقف تماشا کردیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

۱۹۰۸ء کے بعد اقبال کی شاعری باضابطہ ملی شاعری کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ان کی زندگی کا مقصد صرف کھوئے ہوئے کی جستجو اور اپنی درماندہ قوم کو بام عروج پر پہنچانے کی حتی المقدور کوشش ہوتی ہے۔اقبال ''بلاد اسلامیہ'' کے نام سے لکھی ہوئی اپنی نظم میں اس قوم کی زبوں حال اور شکست خوردگی پر آنسو بہاتے ہیں اور اس امید پر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ اس تاریکی کے بعد صبح نو ضرور ہوگی جب اس امت کو بام عروج نصیب ہوگا۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سرزمین دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمین
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمی محفل کی یاد
جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

یہ نظم اوّل سے آخر تک تاثیر سے پُر ہے۔اقبالؔ نے اس قسم کی نظمیں اس لئے لکھی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہی حاصل ہو شاید اس طریقہ سے ان کے اندر اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے اور دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس نظم کے ہر شعر میں اپنی اثر آفرینی کا کمال دکھایا ہے۔

اقبال نے اس نظم میں بلادِ اسلامیہ کے پانچ مشہور ترین شہروں کا نہایت پُر تاثیر انداز سے ذکر کیا ہے۔ دہلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ اور مدینہ منورہ اگر ان پانچ اہم شہروں کی تاریخ لکھی جائے تو بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی:

> ''بلا مبالغہ ملت اسلامیہ کی تیرہ سو سال کی تاریخ مرتب ہو جائے گی۔''(۲)

''گورستانِ شاہی'' کے نام سے ایک نظم میں اقبالؔ نے مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہایا ہے انہوں نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیگر قوموں کے زوال کے ساتھ امت مسلمہ بھی زوال سے دوچار ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کی اس دنیا پر طوطی بولتی تھی لیکن اب اس کی حالت ایک خاموش شہرِ خموشاں کی سی ہوگئی ہے۔ اقبالؔ نے اس نظم میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی داستاں بڑے ہی پرتاثیر انداز میں بیان کی ہے جو کافی درد انگیز ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہوں:

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گذر
چشم کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے، باقی نشاں تک بھی نہیں
دفتر ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسمان سے ابرِ آزاری اٹھا، برسا گیا

اس طویل نظم کے آخری بند میں اقبال نے اس بات کو پوری طرح سے محسوس کیا کہ یہ چند اچھے حکمراں جیسے سلطان نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان محمد فاتح، شہاب الدین غوری،

سلطان بیبرس، سلطان عالمگیر، سلطان ٹیپو شہید کی یادیں یہ امت ایک بار پھر تازہ کرے گی۔ جنہوں نے امت مسلمہ کے لئے ایک نظیر قائم کی اور خالص اسلامی جذبہ کے ساتھ حکمرانی کی۔

اس بند کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریہ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینہ خاموش میں
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

''ترانہ ملی'' دراصل وطنیت (Nationalism) کے عقیدہ کی تردید ہے۔ اقبال وطن کی محبت میں بالکل دیوانے سے ہو گئے تھے اور اسی محبت کی وجہ سے انہوں نے ''ترانہ ہندی'' نظم لکھی تھی جب انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی ہوئی اور انہوں نے یورپ میں وطنیت کے تعلق سے جو خرابیاں اور اس کی تباہ کاریاں دیکھیں تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطن کے نام پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آرہے ہیں۔ بشریت جیسی کوئی چیز ان قوموں میں نظر نہیں آتی ہے۔ اس طرح وہ اس نظریہ سے تائب ہو کر خالص اسلام کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے ''ترانہ ملی'' کے نام سے نظم لکھی اور ترانہ ہندی کا ایک طرح سے کفارہ ادا کیا۔

اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اسی طرح ان کی نظم ''وطنیت'' (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) اس نظم میں اقبال نے پوری طرح سے صراحت کی ہے کہ وطن کا تعلق اگر عام مفہوم سے ہے تو یہ بات بجا ہے کہ وطن سے ہر شخص کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ وطنیت سیاسی معنی میں مستعمل ہے تو یہ وطنیت خالص اس امت کے لئے تباہی کا باعث ہوگی۔ چنانچہ اسی اصول وطنیت کے دام میں گرفتار ہوکر عربوں نے ۱۹۱٦ء میں انگریزوں کے ساتھ مل کر ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ اس کی سزا وہ آج تک اسرائیل نام کی ایک سلطنت کو عالم اسلام کے قلب میں قائم دیکھ رہے ہیں۔ جب جنوری ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی نے دہلی کے جلسہ میں یہ کہا تھا کہ ''موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' تو اقبال نے ان کے اس غیر اسلامی نظریے کے خلاف سخت سرزنش کی تھی۔ ''ارمغان حجاز'' میں ''حسین احمد مدنی'' کے عنوان سے ایک قطعہ جو درج ذیل ہے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبرز مقامِ محمد عربیؐ است
بمصطفےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسی طرح بانگِ درا میں اقبال نے ''وطنیت'' کے تصور کو پاش پاش کرنے کے لئے ''وطنیت'' (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

''شکوہ'' ایک طویل نظم ہے جس میں اقبال نے خدا سے شکوہ کیا ہے کہ تیرے دین کی خاطر اس امت مسلمہ نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن اس کے باوجود مسلمان اس زمانے میں پستی کا شکار ہے اور تیرا فیض عام ایسا لگتا ہے کہ بالکل ختم ہوگیا ہے۔ اقبال نے اس نظم میں ہر پہلو کو پوری طرح سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہر شعبے کو کسی نہ کسی طرح اس نظم کا حصہ بنایا ہے اور کہا کہ تیرے دین کو پھیلانے کے لئے مسلمانوں نے کس کس طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ لیکن تیری یہ نظر کرم صرف کفار پر ہے اور مسلمان زبوں حالی کا شکار ہے۔

اسی طرح ''جواب شکوہ'' میں اقبال نے اللہ تعالی کی طرف سے بندوں کے شکوہ کا پوری طرح تسلی بخشا جواب دیا ہے اور کہا کہ تمہارا یہ شکوہ بے جا ہے۔ انہوں نے اللہ کے زبان سے یہ کہلوایا ہے وہ لوگ اور تھے جنھوں نے امت مسلمہ کی بھلائی کے لئے کارنامے انجام دیئے لیکن تمہاری وہ حیثیت اب صرف سمندر میں جھاگ یا پانی میں بلبلوں کی ہے۔

''شکوہ'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

محفلِ کون ومکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

''جواب شکوہ'' سے یہ بند ملاحظہ ہو:

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟

وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اسی طرح جب اقبال کی مشہور نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال نے امت مسلمہ اور خاص طور سے نوجوانون سے مخاطب ہو کر یہ بات کہی ہے کہ اے امت مسلمہ کے جگر گوشو! کبھی تم نے اپنے آپ پر غور وفکر کیا ہے پہلے تمہاری کیا حیثیت تھی اب تمہاری کیا حیثیت ہے۔ تم اب ذہنی وفکری اعتبارِ سے تحت الثریٰ میں پہنچ گئے ہو اور تم اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھول کر دوسروں کی گدائی کرنے لگے ہو اور ایک طرح سے امت مسلمہ کے زخم پر مرہم رکھتے ہوئے اقبال نے یہ بات کہی ہے کہ حکومت جو تمہاری چلی گئی ہے وہ ایک عارضی چیز ہے۔ یہ دنیا کا اصول ہے حکومت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مگر ایک چیز جو ہمیں بہت زیادہ تکلیف پہنچانے کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ جو علم تمہارے پاس ہونا چاہئے تھا وہ اب یورپ میں منتقل ہو چکا ہے یہ دیکھ کر میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ اقبال نے اپنے ان اشعار میں یہی بات اس امت کے گوش گذار کی ہے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا وہ اک عارضی شئے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

''غرہ شوال یا ہلال عید'' اقبال کی نہایت ہی پر مغز اور شاندار نظم ہے۔ اقبال نے یہ معرکتہ الآرا نظم اس زمانہ میں لکھی تھی جب دنیائے اسلام خصوصاً ترکی اور ایران پر چاروں طرف سے مصائب کی گھٹائیں چھارہی تھیں، اقبال نے اس نظم میں جوانہوں نے ۱۹۱۲ء کے شروع میں لکھی تھی۔ بظاہر ہلالِ عید سے خطاب کیا ہے لیکن دراصل قوم کو مخاطب کیا ہے، اس نظم کے دوسرے بند کے ہر مصرع میں نشتر پوشیدہ ہے، اس نظم میں انہوں نے کہا کہ اے مسلمانو! ہوش میں آؤ! آنکھیں کھولو! دیکھو آج زندگی کی بساط پر تم ہر خانہ میں مات کھارہے ہو، ہر جگہ ذلیل ہورہے ہو، اس کے بعد اپنی حالت کا موازنہ غیر مسلموں کے ساتھ کرو اور دیکھو وہ کس طرح زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کررہے ہیں، تم فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو بلکہ تمہاری قوم میں آئے دن نئے نئے فرقے پیدا ہورہے ہیں جو اپنے سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں لیکن دوسری قومیں فرقہ بندی کو مٹارہی ہیں۔ اس نظم کو سمجھنے کے لئے ہمیں ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۳ء کی تاریخ کا علم ہونا بہت ضروری ہے اس کے بغیر اس نظم کو ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں ایران پر بہت برا وقت پڑا ہوا تھا۔ انگریزوں اور روسیوں نے ایک خفیہ معاہدہ کی رو سے ۱۹۰۷ء میں ایران کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا۔

اسی طرح ترکی کی اس وقت کی تاریخ ۱۸۹۷ء تا ۱۹۱۲ء کی تاریخ پیش نظر نہ ہو تو عام آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اقبال نے یہ نظم کیوں لکھی، اقوام یورپ کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا تھا کہ جب تک سلطان روم کے نام کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کا لقب وابستہ ہے اس کی مرکزی حیثیت ختم نہیں ہوسکتی اس لئے یہ قومیں ترکی کے خلاف رات دن ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں، ان ہی دشمنانِ ملت کے ایما پر ۱۸۹۷ء میں یونان نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور جب مارشل ادوہم پاشا نے یونان کو مسلسل شکستیں دے کر ایتھنز کا محاصرہ کیا تو روس، فرانس اور برطانیہ تینوں نے مل کر ترکی کو الٹی میٹم دے دیا کہ یونان خالی کردو، ورنہ ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس واقعہ سے آپ یورپ کے طرز عمل کا

اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۹۰۸ میں دستوری حکومت کا اعلان کر دیا تھا مگر وہ در پردہ دستوری حکومت کے خلاف تھے اس لئے ۱۹۰۹ء میں ترکوں نے انہیں معزول کر دیا اور انجمن اتحاد ترقی کے ارکان برسر اقتدار آ گئے ان میں اور شاہ پسند جماعت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اسی سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور ۱۹۱۲ میں بلغاریہ نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ اسی داخلی اور خارجی صورت حال کو دیکھ کر اقبال نے ۱۹۱۲ء میں خلافت کے ختم ہونے کی بات کہہ دی تھی دراں حالانکہ خلافت باضابطہ طور پر ۱۹۲۴ء میں ختم ہوئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

''شمع وشاعر'' نظم جو ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی اقبال کی بانگ درا کی سب سے شاندار ایک طویل نظم ہے جس میں شاعری اور فلسفہ کا امتزاج ہے۔ ساری نظم رمزیہ انداز میں لکھی گئی ہے، الفاظ کچھ ہیں لیکن ان سے مراد کچھ اور ہے۔ اقبال مسلمان ملکوں کی تباہ حالی سے بہت متاثر تھے اس لئے اکثر اشعار میں سوز و گداز کی کیفیت نمایاں ہے۔ اس وقت عالم اسلام پر مصائب کا نزول اس طرح ہو رہا تھا جیسے کہ کوئی ہار ٹوٹ جائے۔ مصائب ایک کے بعد ایک نازل ہو رہے تھے۔ اقبال نے قوم کی مجرمانہ غفلت کی داستاں انتہائی دردناک انداز میں بیان کی ہے لیکن اس کے بعد تریاق بھی مہیا کیا ہے یعنی دوبارہ سربلندی کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ خاص طور سے مندرجہ ذیل چند اشعار میں انہوں نے ایک نئی صبح کی نوید سنائی ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

اسی طرح ''مسلم'' کے عنوان سے اس شاندار نظم میں اقبال نے امت مسلمہ کے تیئں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ مسلمان اس وقت جس پستی اور قعر مذلت کے دلدل میں ہیں اس کے بعد ایک نئی صبح ہونے والی ہے۔ اگر مسلمان اس دنیا سے مٹ گئے تو اسلام بھی مٹ جائے گا اور اسلام اگر مٹ گیا تو انسانیت بھی مٹ جائے گی اور بنی آدم رسواو ذلیل وخوار ہو جائے گا۔

اسی کو اقبال نے چند اشعار میں بہت ہی واضح انداز میں یوں کیا:

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے
آشکارا ہیں مری آنکھوں پر اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومیدِ پیکارِ حیات

''حضورِ رسالت مآب میں'' ایک طرح سے بانگ درا کی جان ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے دردِ دل کا مکمل اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام دکھوں کا مداوا اس نظم میں نظر آتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو انھوں نے ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ انما المؤمنون اخوۃ۔ یعنی تمام دنیا کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ یہ بتایا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک جسد

واحد کی شکل میں ہیں اگر جسم کے ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے اسی طرح اس امت مسلمہ کے کسی فرد یا گروہ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جسدِ واحد ہونے کی وجہ سے تمام امتِ مسلمہ اس درد کو محسوس کرتی ہے۔ اقبال نے شہادت کی موت کو ایک ایسے شاندار پیرائے میں بیان کیا ہے کہ جو خوشی شہادت کی موت میں ہے اگر جنت بھی حاصل ہو جائے تو اس میں وہ خوشی محسوس نہیں ہوگی۔ خاص کر اس نظم کا آخری بند زبردست اہمیت کا حامل ہے اس میں اقبال کی فکر کی انتہا اور خواہش کھل کر نظر آتی ہے۔ وہ بند ملاحظہ ہو:

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی!
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اسی طرح ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کے نام سے جگر دوز مرثیہ اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ کی یاد میں لکھا تھا جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی اس شیر دل عرب لڑکی کی شہادت کا حال سب سے پہلے ۱۲ نومبر ۱۹۱۲ء کے مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال میں شائع ہوا تھا۔ اس نظم سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اقبال اس زمانہ میں ملت کے غم میں اشکبار رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فاطمہ بنت عبداللہ کو زندگی دوام عطا کر دی جب تک مسلمان بانگِ درا پڑھیں گے اس بہادر لڑکی کا نام بھی زندہ رہے گا۔

اٹلی نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں طرابلس (موجودہ لیبیا) پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت کی سلطنت کے پاس بہت

ہی مختصر فوج تھی۔ بے سروسامانی کی حالت میں انہوں نے کامل پامردی کے ساتھ اٹلی کا مقابلہ کیا۔ فاطمہ بنت عبداللہ میدان جنگ میں مشکیزہ کاندھے پر اٹھائے زخمیوں کو پانی پلاتی پھر رہی تھی اس لڑکی کی عمر صرف چودہ سال کی تھی لیکن اس نے شیروں کا دل پایا تھا، فاطمہ بیشک شہید ہوگئی لیکن ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا کران کوزندہ کرگئی۔اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے

ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

''محاصرہ ادرنہ'' بھی اقبال کی ایک شاندار نظم ہے۔ انہوں نے یہ نظم اس لئے لکھی کہ ترکوں کی سیرت کا ایک روشن پہلو دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس گئی گذری حالت میں ترکوں کے دل میں شریعت اسلامیہ کا کس قدر پاس ہے۔ بلغاریہ، رومانیہ اور یونان نے مل کر ترکی پر حملہ کردیا تھا۔ جنرل شکری پاشا جو ایڈریانوپل کے محاذ کا سپہ سالار تھا جب ترکی افواج دشمن کے حملہ کی تاب نہ لاسکیں تو شکری پاشا ایڈریانوپل کے قلعہ میں داخل ہوگیا اور دشمنوں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، سپہ سالار نے پانچ ماہ تک بڑی ہمت کے ساتھ مدافعت کی تاکہ کہیں سے کمک آجائے لیکن کمک نہ آسکی اور مفتی شہر نے فتوی دیا کہ ذمی کا مال مسلمانوں کے لشکر پر حرام ہے۔اس فتوے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے بھوک کی تکلیف برداشت کی لیکن غیر مسلم رعایا کے سامان خوردونوش کو واپس کردیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیئے۔

ایڈریانوپل جسے ترکی میں ادرنہ کہتے ہیں، فتح قسطنطنیہ سے پہلے ترکی کا پایہ تخت تھا، یہ شہر فروری ۱۹۱۳ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، لیکن غازی انور پاشا نے اس کو جولائی ۱۹۱۳ میں دوبارہ فتح کیا تھا۔

اقبال نے ''غلام قادر روہیلہ'' کے عنوان سے ایک تاریخی واقعہ کو ایک نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غلام قادر روہیلہ نواب نجیب الدولہ کا پوتا ہے۔ نجیب الدولہ کا احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کا زور توڑنے کے لئے بلانے میں ایک بڑا رول رہا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری

جنگ میں مرہٹوں کی اس تاریخی لڑائی میں کمر توڑ دی تھی۔ نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ضابطہ خان تخت پر بیٹھا تو مرہٹوں نے سازش کے ذریعہ شاہ عالم ثانی کو اپنا ہمنوا بنا کر روہیلہ علاقے پر حملہ کروایا اور جب روہیلوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو روہیلہ سرداروں کی عورتوں کا ہاتھ پکڑ کر مغل اور مرہٹے اپنے خیمے میں لے گئے۔ اس ذلت کو غلام قادر روہیلہ جس کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال تھی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے اسی کا انتقام لیا ہے۔ اسی واقعہ کو اقبال نے نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔

بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے

> ''اگر وہ واقعہ راقم الحروف پر گذرتا تو موقع حاصل ہو جانے کے بعد بھی یہی کرتا اس نے پھر بھی افغانی شرافت سے کام لیا یعنی کسی عورت کی بے عزتی نہیں کی۔'' (۳)

اس نظم میں یہ شعر اہمیت کا حامل ہے، ملاحظہ ہو:

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

''دریوزہ خلافت'' یعنی خلافت کی بھیک نظم کا تعلق ان واقعات سے ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو عربوں کی غداری کی بدولت شکست فاش نصیب ہوئی چنانچہ ۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن انگریزوں کی دلی تمنا پوری ہوگئی۔ چنانچہ برطانیہ کے وزیر اعظم نے جب جنرل ایلینی فاتح فلسطین کے سینے پر تمغہ لگایا تو اس کی فتح کو ہلال پر صلیب کی فتح قرار دیا اور کہا کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں جو شکست ہمیں نصیب ہوئی تھی اس کا انتقام اب ہم نے لیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمان کے ساتھ جو جھوٹے وعدے کیئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو ترکی کی سالمیت برقرار رکھی جائے گی۔ لیکن

برطانیہ نے ترکی کے خاتمے کے لئے کارروائی شروع کردی۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی قیادت میں دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ جنوری ۱۹۲۰ء میں برطانیہ ایک وفد روانہ کیا جائے جو حکومت برطانیہ سے درخواست کرے کہ خلاف کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ وفد آٹھ مہینے برطانیہ میں رہ کر ۶۵ ہزار روپے ضائع کرنے کے بعد بے نیل ومرام واپس آیا تھا۔

اقبالؔ کی نگاہ دوربین نے پہلے ہی محسوس کرلیا تھا کہ حکومت، برطانیہ جو خود زوال خلافت کی سب سے زیادہ آرزومند ہے وہ کب ارکانِ وفد کی باتوں پر غور کرے گی اس لئے انہوں نے یہ نظم تحریر کی۔

اس نظم کے اشعار ملاحظہ ہو:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگاہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

''خضرِ راہ'' بانگ درا کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کی خاص بات یہ ہے کہ اس نظم سے اقبال کی انقلابی شاعری کا آغاز ہوتا ہے وہ پہلی مرتبہ اس فاقہ کش اور بے کس طبقہ کے ہمدرد بن کر سامنے آتے ہیں جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہوجانے سے پہلے ادا کرو۔'' اسلام دنیا کا پہلا اور آخری دین ہے جس نے اس صداقت کا اعلان کیا کہ ''لاملوکیت فی الاسلام'' یعنی اسلام ملوکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔

اقبالؔ نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمان پیہم دس بارہ سالوں سے زبردست آزمائش سے دوچار تھے ان کا دل تو پہلے ہی سے مسلمانوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔

۱۹۱۹ء میں جب قسطنطنیہ سے خلیفہ اور خلافت دونوں کا خاتمہ ہو گیا تو اقبال کے دل پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ خضر راہ کا یہ شعر ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰؐ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

۱۹۱۹ء میں سلطنت ہی پارہ پارہ ہو گئی ہندوستان سے لے کر مراکش تک تمام دنیائے اسلام پر تاریک گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ عربوں نے انگریزوں کے دامِ فریب میں آ کر ترکوں سے عین وقت پر غداری کی۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ دمشق اور بغداد پر اغیار کا قبضہ ہو گیا اور حجاز کا حکمران برطانیہ کا وظیفہ خوار بن گیا۔

اقبال نے اس نظم میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام سے دوری کی وجہ سے یہ آفات نازل ہوئی ہیں۔ انہوں نے اس ذلت سے نکلنے کے لئے اس امت کو ایک حکیم کی طرح نسخے بتائے ہیں اگر یہ امت اس نسخے پر کار بند رہی تو یقیناً ایک مثالی قوم اور عظمت رفتہ کو دوبارہ بحال کر سکتی ہے بلکہ عمر فاروق کا زمانہ دوبارہ اس دنیا میں آ سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل درنگر
ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بیخبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

مذکورہ بالا حکیمانہ نسخے پر یہ قوم کاربند رہتی ہے تو اس امت کے مستقبل کے تعلق سے ایک دھندلی سی تصویر بھی اقبالؔ نے دکھائی ہے۔ یہ امت اپنی ناکامی اور نامرادی کی جو ذلت جھیل رہی ہے اس کے بعد ایک نئی صبح آنے والی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ

''طلوعِ اسلام'' ایک طویل نظم ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ اس کو انہوں نے ۱۹۲۲ء میں لکھا تھا چونکہ اس زمانہ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے سقاریہ کی جنگ میں یونانیوں کو شکست دے کر دنیا پر حقیقت آشکارا کردی تھی کہ ترک ابھی زندہ ہیں اور سمرنا فتح کر کے مسٹر گلیڈسٹن کے خاندان میں صفِ ماتم بچھا دی تھی اسی لئے اقبالؔ نے جس طرح مایوسی کے عالم میں ''شمع و شاعر'' لکھی تھی، اسی طرح رجائیت کے عالم میں یہ نظم لکھی۔

اس نظم کا بنیادی تصور خود اس کے عنوان میں مضمر ہے اور اس کا پہلا بند مسرت اور شادمانی کے جذبات سے لبریز ہے بلکہ ساری نظم میں یہی رنگ نظر آتا ہے۔ اقبالؔ نے مصطفیٰ کمال کی کامیابی کو ''طلوعِ اسلام'' سے تعبیر کیا ہے۔ خضرِ راہ میں کہیں نہ کہیں ناامیدی اور مایوسی کا رنگ بھی جھلکتا ہے لیکن اس نظم میں اقبالؔ کا دل اس یقین سے معمور ہے کہ اگر مسلمان اپنے اندر ایمان پیدا کرلے تو وہ پھر ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ، تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی کہ

''مسجد قرطبہ'' اقبال کی ایک نہایت ہی شاندار نظم ہے اس نظم کا شمار ''بالِ جبریل'' کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ اقبال دوسری گول میز کانفرنس کے بعد جب وہ لندن سے لوٹ رہے تھے تو اسپین میں انہوں نے کچھ عرصہ قیام کیا تھا اور مسجد قرطبہ میں نماز بھی پڑھی اور یہیں پر یہ نظم تحریر کی تھی۔ یہ نظم اسی عہد کی یاد دلاتی ہے۔ یہ مسجد صدیوں سے محروم اذاں ہونے کے باوجود آج بھی تمام دنیا کی مساجد کی سرتاج ہے۔ بلاشبہ یہ مسجد عجائبات عالم میں سے ہے اس کو سلطان عبدالرحمان الداخل نے جامع دمشق کے نمونہ پر تعمیر کرایا تھا اور اس کے بعد ان کے جانشینوں نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ۱۲۳۶ء میں زوالِ قرطبہ کے بعد یہ عدیم المثال مسجد گرجا بن گئی۔

اس نظم میں کل آٹھ بند ہیں۔ پہلے بند میں اس دنیا کی بے ثباتی بیان کی ہے اور دوسرے بند میں عشق کی صفات واضح کی ہے۔ تیسرے بند میں مسجد قرطبہ سے خطاب کیا ہے اور یہ

بتایا کہ اس مسجد کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہے۔ چوتھے بند میں مسجد کی شان و شوکت کا تذکرہ ہے اور ضمناً ملت اسلامیہ کی بقا کا مژدہ بھی سنایا ہے۔ پانچویں بند میں مرد مومن کا تصور پیش کیا ہے۔ چھٹے بند میں عربوں کی فتوحات اور عظمت رفتہ کا بیان ہے، ساتویں بند میں یورپ کے بعض اہم انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آٹھویں بند میں اقبال نے الہامی رنگ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی پیشگوئی کی ہے اور آخری شعر میں اپنا فلسفہ پیغام کی صورت میں پیش کیا تا کہ اس نظم کا مقصد واضح ہو سکے۔ (۴)

ہمارے پیش نظر دراصل چھٹا اور آٹھواں بند ہے جس میں اقبال نے یورپ کے تعلق سے گفتگو کی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ جرمنی، فرانس اور اٹلی میں انقلاب رونما ہو چکا ہے تو اگر اسپین میں بھی عنقریب کوئی انقلاب رونما ہو جائے تو بعید از قیاس نہیں ہے۔ زوالِ غرناطہ کے بعد یورپ میں بہت سے انقلابات رونما ہو چکے ہیں مثلاً سولہویں صدی میں جرمنی میں لوتھر نے اصلاح کلیسائے روم کے نام سے ایک تحریک شروع کی جس نے یورپ میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا جس کی بدولت نصف سے زائد مسیحی دنیا پاپائے روم کے مذہبی اقتدار سے آزاد ہو گئی۔ اصلاح کا ایک زبردست نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پیر کنشت کی عصمت کا عقیدہ باطل ہو گیا۔ جو ممالک مثلاً جرمنی، برطانیہ پاپائے روم کے اقتدار سے آزاد ہو گئے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی میں بھی عظیم الشان انقلاب برپا ہوا جس کا نام ہی انقلاب فرانس ہے۔ اس انقلاب سے اہل مغرب کی دنیا ہی بدل گئی کیونکہ اس انقلاب کی بدولت یورپ کی قومیں حریت، اخوت اور مساوات کے الفاظ سے آشنا ہوئیں۔ اسی طرح اطالوی قوم بھی جو عرصہ دراز سے قدامت پرستی میں مبتلا تھی تجدید و اصلاح حال کی بدولت از سر نو طاقتور ہو گئی ہے۔

اگر اسی طرح مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا انقلاب رونما ہو جائے جس کی بنا پر ان میں زندگی پیدا ہو جائے تو بعید از قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم میں جو ایک عام اضطرابی کیفیت پائی جاتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جلد یا بدیر ان میں بھی انقلاب برپا ہوگا اس لئے اقبال منتظر ہیں

کہ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

اقبال قرطبہ کے مشہور دریا الکبیر کے کنارے بیٹھ کر اس امت مسلمہ کے عروج کا خواب دیکھتے ہیں اور دریا کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں تجھے کیا خبر کوئی شخص تیرے کنارے آئندہ زمانہ کا خواب دیکھ رہا ہے۔ میں جس آنے والے زمانہ کا تصور کر رہا ہوں، وہ اگرچہ ابھی دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے لیکن میں اس کے آغاز کو دیکھ رہا ہوں اگر میں آنے والے انقلاب کی تفصیل بیان کر دوں تو یورپین اقوام اس پر یقین نہیں کریں گی اس لئے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین ضرور ہونا چاہئے جو قوم اپنا مقصدِ حیات متعین نہیں کرتی اس کی زندگی بالکل بے معنی ہے۔ اس نصب العین کے حصول کا جذبہ عشق کے درجہ پر پہنچ جائے۔ کیونکہ عشق کے بغیر سب ارادے ناتمام رہتے ہیں اس کے بغیر کوئی قوم اپنی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرہ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکش انقلاب

صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

''ذوق وشوق'' کے نام سے علامہ اقبالؔ کی یہ بہترین نظم دراصل نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اوراس کا ہر شعر عشق رسول میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت فلسطین کے دوران میں اقبال کے دل میں زیارت گنبد خضراء کا ارمان چٹکیاں لے رہا ہوگا اس لئے ہر شعر میں محبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا رنگ جھلک رہا ہے۔

اس نظم میں علامہ اقبالؔ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب ہو کر کہا ہے کہ اے میرے محبوبؐ! آپ بظاہر سب کچھ ہیں یعنی سب کچھ آپ ہی کے وجود کی بدولت دنیا میں وجود میں آیا اگر آپ نہ ہوتے تو نہ لوح ہوتی نہ قلم ہوتا۔ اور نہ کتاب ہوتی اور آپ کی شان کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ یہ آسمان جس کے طول وعرض کا کچھ پتہ نہیں ہے آپ کے محیط وجود کے سامنے اس کی حقیقت ایسی ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں ایک بلبلا۔

اس کائنات کو آپ ہی کے ظہور سے فروغ حاصل ہوا ہے آپ ہی کے قدموں کی برکت سے ذرہ (بلال حبشی) دنیا میں آفتاب (سیدنا بلال) بن کر چمکا۔ امیر المومنین فاروق اعظمؓ! حضرت بلال کو سیدنا بلال کہتے تھے۔ سلطان سنجر اور سلطان سلیم آپ کی شانِ جلال اور حضرت جنید اور حضرت بایزیدؒ آپ کی شانِ جمال کے مظہر ہیں۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود!
فقر جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے!
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب

بالِ جبریل میں ''ساقی نامہ'' کے عنوان سے علامہ اقبالؔ کی نظم غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں غیر معمولی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ساری نظم میں کہیں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اول سے آخر تک آمد ہی آمد ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نظم لکھتے وقت اقبالؔ پر فیضان سماوی کا نزول ہو رہا تھا۔

ہمارا موضوع صرف سیاسی پہلو ہے اس لئے میں اس طویل نظم میں صرف سیاسی پہلو پر اکتفا کرتا ہوں۔ اقبالؔ نے اس نظم میں حالات حاضرہ اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہر جگہ انقلاب کارفرما نظر آتا ہے۔ بنی آدم کی طرز حیات میں عظیم الشان تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور نئی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں اور عصر حاضر کی جدید سیاست میں زبردست تبدیلی ہونے والی ہے۔ انہوں نے ایک طرح سے بہت سے معاملات میں پیشین گوئی بھی کی ہے۔ چینی جو صدیوں سے شہنشاہی پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے۔ اپنی آزادی کے لئے میدان میں آچکے ہیں اور اقبال نے صرف آزادی ہی نہیں بلکہ دنیا کی ایک بڑی طاقت بننے اور معاشی اعتبار سے سرمایہ واری کو ہڑپ کر لینے کے تعلق سے اس کی پیشین گوئی کی ہے۔ آج جب ہم چین کو دیکھتے ہیں تو محوِ حیرت ہو جاتے ہیں کہ اقبالؔ نے ۱۹۳۵ء میں یہ بات کیسے کہہ دی۔ اقبال کی ہر اس بات کی تصدیق ہو رہی ہے جو انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے دنیا والوں کے سامنے منکشف کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمین میر وسلطان سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

عرب اقوام بھی فلسطین اور عراق وشام اور حجاز میں مغربی استعمار کے خلاف صف آراء ہو چکی ہیں اور تائید غیبی کی منتظر ہیں۔ واقعی ان کا ہر اندازہ اور ہر پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور آئندہ بھی بہت کچھ ثابت ہونے والی ہے۔

اسی طرح بال جبریل میں ''نپولین کے مزار پر'' اور ''مسولینی'' پر نظمیں ہیں۔ اقبال ان دونوں کے مداح نہیں تھے بلکہ وہ ان دونوں کی طرف صرف اس لئے متوجہ ہوئے کہ ان کے اندر فولاد جیسا عزم تھا اور انہوں نے کہیں بھی کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق اپنی قوم کے تئیں بڑے ہی زبردست کارنامے انجام دیئے۔ اس لئے اقبال سیاسی تاریخ کی ان دو بڑی شخصیتوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اقبال نے نادر شاہ افغان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کے دل میں دین اور ملت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ نہایت شریں اخلاق نہایت منکسر المزاج اور رقیق

القلب تھے۔ اس نظم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں نادر شاہ کی کس قدر عظمت اور محبت جاگزیں تھی اور وہ افغانستان کو کس قدر خوش حال اور سر بلند دیکھنا چاہتے تھے۔

''تاتاری کا خواب'' ایک بہت ہی دردناک اور المناک نظم ہے جس میں اقبال نے تمثیلی رنگ میں ترکستان کے باشندوں کو وحدت واتحاد اور تنظیم کا درس دیا ہے۔ ترکستان پر روسیوں نے بہت مظالم ڈھائے۔ دشمنوں نے دین وملت دونوں کو تباہ کر دیا ہے۔ حکومت، عزت اور آزادی ہر چیز ختم کر دی گئی۔ سمرقند اور بخارا یہ دونوں شہر کسی زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت اور تہذیب کا مرکز رہ چکے ہیں دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ:

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن
کہیں ترسا بچوں کی چشم بیباک
ردائے دین و ملت پارہ پارہ
قبائے ملک و دولت چاک در چاک
مرا ایماں تو ہے باقی و لیکن
نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک
ہوائے تند کی موجوں میں محصور
سمرقند و بخارا کی کفِ خاک

بالِ جبریل کی چھوٹی سی نظم ''یورپ'' کے عنوان سے ہے یہ نظم دراصل جرمن فلسفی نطشے کی فکر سے ماخوذ ہے۔ قوم یہود کے تعلق سے نطشے کی جو رائے تھی علامہ اقبال کی بھی رائے وہی تھی۔ علامہ کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ یہودی جو بڑی بڑی کمپنیوں کے مالک ہیں۔ ان کا یورپ اور امریکہ کی تمام تجارت پر مکمل کنٹرول ہے۔ یہودی اپنے اسی اثر ورسوخ کو استعمال میں لاکر اپنی مرضی کی حکومت بناتے اور ختم کرتے ہیں اور ان کا جو بھی مشن ہوتا ہے اس کے لئے وہ مجبور کرتے ہیں خاص کر یہودیوں نے برطانیہ پر مکمل تسلط کر کے اس کے ذریعہ سے فلسطین پر ۱۹۱۶ء میں قبضہ اور پھر ۱۹۱۶ء میں ہی بلفور اعلامیہ

اور پھر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی تشکیل اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرف علامہ اقبال نے اپنی اس نظم میں اشارہ کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سودخوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

''ضربِ کلیم'' کی اس مختصر نظم میں اقبال نے حکمت فرنگ اور حکمت قرآن کے مقصد کا موازنہ کیا ہے اور اسلام کے نقطہ نگاہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس عہد میں تمام دنیا کے ممالک کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں لیکن اس کے بعد فرنگ کا مقصد یہ ہے کہ قوموں میں تفریق پیدا کی جائے اور اس کو برقرار رکھا جائے۔ اس کے برعکس اسلامی سیاست کا نصب العین ہے کہ تمام امتیازات مٹا کر وحدت نسل انسانی قائم کی جائے۔ اسی لئے مکہ معظمہ یعنی اسلام نے خاک جنیوا یعنی اقوام مغرب کو یہ پیغام دیا کہ جمعیت اقوام سے جمعیت آدم زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم واقعی انسانیت کی بھلائی چاہتے ہو تو جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم قائم کرو۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ان فاتح ممالک نے ''مجلس اقوام عالم'' قائم کی تھی اس کا مقصد ایشیا کے دیگر ممالک کو غلام بنانا تھا، اسی پر اقبال نے ۱۹۲۳ء میں اس مجلس پر نہایت عمدہ تبصرہ کیا تھا۔

من ازیں پیش ندانم کہ کفن دزداں چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یعنی میں اس انجمن کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ یورپ کے کفن چوروں نے مل کر ایک انجمن بنائی ہے تاکہ وہ قبروں (ایشیا کی مردہ قوموں) کو آپس میں تقسیم کر سکیں۔ یہ نہایت بلیغ تبصرہ ہے۔

ایک شعر ملاحظہ ہو:

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ان کفن چوروں نے ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے نام سے ایک انجمن بنائی۔ اس انجمن کا مقصد اب تک یہ رہا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کو استعمال کر کے صرف اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور غریب اقوام پر مسلسل دباؤ ڈالنے کے لئے قرارداد پاس کر کے ان کے خلاف پابندیاں عائد کرتے رہتے ہیں اور جب ان پر خود ضرب پڑتی ہے تو ویٹو کا کھل کر استعمال کرتے ہیں۔ بیچارے مظلوم ممالک خاص طور سے ایران، شمالی کوریا، زمبابوے اور شام اسی طرح کی پابندیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن اب ایسا محسوس ہو رہا ہے اقوام متحدہ بھی شکست و ریخت کے مرحلہ سے گذر رہی ہے اور دنیا تیسری جنگ کے قریب پہنچ چکی ہے۔

''ضرب کلیم'' کی مختصر نظم ''پنجابی مسلمان'' کے عنوان سے ہے۔ علامہ اقبال اس قوم کے نباض تھے اور انہوں نے اگر کسی کے تعلق سے جو بھی تبصرہ کیا ہے وہ ہو بہو سچ ثابت ہوتا ہے۔ یہ نظم ان کی اسی نباض طبیعت کی غماز ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کرے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا!
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگادے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

پنجابی مسلمان خاص طور سے موجودہ پاکستانی پنجاب کی صورت حال اور وہاں کی سیاسی صورت حال کو آپ پیش نظر رکھیں گے تو آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کچھ باہری عناصر نے وہاں کے مذہبی طبقہ پر جو قبضہ کر رکھا ہے اسکی واضح مثال آپ کو وہاں ملے گی خاص طور سے لشکر جھنگوی جو خالص پنجابی

مسلمانوں پر مشتمل ہے اس کی تشکیل کسی عرب ملک کے علمانے ایران کی دشمنی میں کی اور دعوی کیا کہ شیعہ کافر ہیں اور ان کو مارنا کارثواب ہے تو وہ شیعہ کو مارنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے اور یہ بالکل نہیں سمجھتا کہ شیعہ پہلے انسان ہیں بعد میں وہ شیعہ ہیں وہ اسی پر غور کر لیتے تو وہ انسان کا بیجا خون نہیں بہاتے۔ بقول اقبال پنجاب کے مسلمان تحقیق کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ یہ چیز ان کو غور وفکر کا موقع ہی نہیں دیتی۔ وہ صرف دوسروں کے کہنے پر استعمال ہو رہے ہیں۔ خاص طور سے ایسے ہی لوگوں پر علامہ اقبال کی رائے ہے۔ برصغیر میں اب تک جتنے بھی فتنے اٹھے ہیں وہ زیادہ تر پنجاب سے ہی اٹھے ہیں۔ چاہے قادیانیوں کا فتنہ ہی کیوں نہ ہو۔

ضرب کلیم کی نظم ''امرائے عرب سے'' کے عنوان سے یہ مختصر نظم ہمارے لئے بصیرت کا موقع فراہم کرتی ہے۔ انگریزوں نے ترکوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے عربوں کو ورغلایا کہ ہم تمہیں ترکانِ جفا پیشہ سے آزادی دلا سکتے ہیں اور دنیائے عرب پر تمہیں حکمراں بنا سکتے ہیں، اس لئے تم ترکوں کے خلاف بغاوت کرو اور ہمارے جھنڈے کے نیچے لڑو، جس کی وجہ سے یہ المناک حادثہ پیش آیا کہ فلسطین انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا اور شام و لبنان فرانسیسیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور جس کی کوتاہ بصیرت کی وجہ سے اسرائیل نام کی سلطنت اس عالم عربی پر خنجر کی طرح پیوست ہے۔

اسی لئے علامہ نے عربوں کو سمجھایا کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ بستے ہیں ایک مسلم اور دوسرے غیر مسلم تمام مسلمانوں کا آپسی رشتہ محمد عربی کی وجہ سے ہے اس لئے وہ بھی عرب ہیں اور باقی دنیا بولہبی ہے لیکن عرب اس تعلیم کو بھول گئے اور بولہبی کے پھندے میں گرفتار ہو گئے۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

کرے یہ کافر ہندی بھی جرات گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو!
وصالِ مصطفیٰ، افتراق بولہبی

نہیں وجود حدود وثغور ہے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی

''بال جبریل''میں ''اقوام مشرق'' کے عنوان سے دو اشعار کا ایک قطعہ ہے جس میں اقبالؔ نے اقوام مشرق خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب ہو کر جو تعلیم دی ہے وہ زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اقبالؔ نے ایشیائی قوموں کی کوتاہ بینی پر ماتم کیا ہے جو مغربی تہذیب کو اپنے مرض کی دوا سمجھ کر بے سوچے سمجھے تقلید کر رہی ہیں ان کے تعلق سے کہا ہے کہ جن لوگوں کی آنکھیں غلامی اور تقلید کی وجہ سے اندھی ہوگئی ہیں ان کو واضح حقائق بھی نظر نہیں آتے۔وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ مغربی تہذیب جو خود دم توڑ رہی ہے وہ دوسری قوموں کو کس طرح زندگی دے سکتی ہے۔انہوں نے خاص طور سے آج کل کے ترکی، مصر، شام، ایران، عرب برصغیر کے تعلق سے یہ بات کہی ہے کہ یہ تمام ممالک مغربی ممالک کی اندھی نقالی کر رہے ہیں اور اتنا بھی غور وفکر نہیں کرتے کہ اس تہذیب کی بنیاد لادینی فلسفہ پر ہے یہ تہذیب مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ان کا مشورہ امت مسلمہ کے لئے یہ ہے کہ وہ اس مغربی تہذیب سے بالکل دور رہیں۔ان کی اچھی چیزیں آپ بالکل لیں لیکن ان کی تہذیب کے رنگ میں رنگے بغیر۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان کی برائیوں کو ایشیائی اقوام خاص طور سے مسلمانوں نے اپنا لیا ہے لیکن ان کی جفاکشی اور کام کے تئیں انہماک کو بالکل نہیں قبول کیا جس کی وجہ سے یہ ایشیائی ممالک ہر شعبہ حیات میں پیچھے نظر آتے ہیں۔اس لئے انہوں نے امت مسلمہ کو مشورہ دیا کہ وہ ان کی اچھی چیزیں لیں اور ان کی بری باتوں کو ہرگز قبول نہ کریں۔اشعار ملاحظہ ہو:

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکوم و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیوں کر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اقبالؔ کی یہ چھوٹی سی پیشین گوئی جو بال جبریل کی ''انقلاب'' کے عنوان سے چھوٹی سی نظم میں پائی جاتی ہے جو تقریباً پوری ہونے ہی والی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

نہ ایشیاء میں نہ یورپ میں سوز و ساز حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گہی شاید جہانِ پیر کی موت

ان اشعار میں اقبال نے ایشیا اور یورپ کے تعلق سے جو پیشین گوئی کی ہے وہ حرف بحرف کچھ تو سچ ہو چکی ہے اور کچھ ہونے والی ہے۔ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ زندگی کا سوز و ساز نہ ایشیا میں کہیں موجود ہے نہ یورپ میں۔ انسان اپنی زندگی کا مقصد نہ ایشیا میں رہ کر حل کر سکتا ہے نہ یورپ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایشیا میں تو غلامی کی وجہ سے لوگوں کی خودی مردہ ہو چکی ہے اور یورپ میں لادینی اور اشتراکیت کی بدولت ضمیر فنا ہو چکا ہے۔ ان حالات میں اقبال نے پیش گوئی کر دی کہ جلد ہی ان یورپی ممالک کی فکری اور عسکری اور معاشی سطح پر موت ہونے والی ہے چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں یورپ کو زبردست دھچکا لگا اور برطانیہ کا سورج تمام ممالک میں ڈوب گیا اور وہ صرف ایک محدود علاقہ میں سکڑ گیا جہاں سے اس نے شروعات کی تھی۔ نوے کی دہائی میں روس بھی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ اب صاف نظر آتا ہے کہ امریکہ اور باقی ماندہ یورپ کی باری ہے۔ امریکہ اس وقت فکری، معاشی اور عسکری سطح پر زبردست پستی سے دوچار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ اور ان کے حوارین ایران اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھوں جلد ہی شکست و ریخت سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اقبال کی پیشین گوئی سچ ثابت ہونے والی ہے۔ اقبالؔ نے اسی بال جبریل میں ''جمعیت اقوامِ مشرق'' کے عنوان سے ایران کے سپر پاور بننے کی پیشین گوئی کی ہے۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پانی بھی مسخر ہے، ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلک پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

ان اشعار میں یورپ، امریکہ اور روس کے تعلق سے اقبال نے پیشین گوئی کی کہ مغربی اقوام نے سائنس میں بڑی ترقی کر لی ہے اور انسانوں کے علاوہ آج عناصر فطرت بھی ان کے محکوم ہیں لیکن اگر 'فلکِ پیر' یعنی خالق کی نگاہ بدل جائے تو ان تمام اقوام کی سطوت وشوکت کا ایک آن میں خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ان اقوام نے مختلف حیلوں سے ایشیائی قوموں کو غلام بنانے کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے وہ سب یوں ہی دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ اگر تمام مسلمانانِ عالم متحد ہو جائیں تو اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہوگی اور تہران کی قیادت میں انشاء اللہ فتح حاصل ہوگی اور یورپ اور امریکہ کی تمام طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گی۔ ایران ایک سپر پاور کی حیثیت سے اس دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہو جائے گا اور ایک زمانے میں یورپ کی طاقت کا محور جو جنیوا کو حاصل تھا وہ اب تہران کو حاصل ہو جائے گا۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ایران کی قیادت میں ایک متوقع جنگ ہونے والی ہے اس جنگ میں ایران کے اتحادیوں میں شام، لبنان اور فلسطین ہوں گے وہ یورپ کی متحدہ قوت اور امریکہ اور اسرائیل کو شکست سے دوچار کر کے اس منصب پر فائز رہنے کی اپنی اہلیت کو ثابت کر دیں گے اور اس کے بعد اقبالؔ کی پیشین گوئی اپنے اتمام کو پہنچ جائے گی۔ اس وقت ایران سائنس کے تمام شعبوں اور عسکری محاذ پر بلکہ بعض شعبوں میں چوٹی پر ہے۔

امام خمینی کی قیادت میں ایران میں ۱۹۷۹ء میں انقلاب آیا اور اس وقت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی قیادت میں وہ تیزی سے ترقی کی شاہراہ کی طرف گامزن ہے۔ یہ تاریخ میں عدیم المثال واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد پہلی مرتبہ علماء کسی ملک کے حکمراں ہیں۔ یہ وہ نعمت ہمارے لئے ہے کہ ایران اس وقت بام عروج پر پہنچ رہا ہے وہ اس لئے خدا کے نزدیک علم جب تقویٰ سے وابستہ ہو تبھی

وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے نہیں تو ابلیس اسے اپنی راہ سے بھٹکا دیتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جن اسماء کا علم دیا گیا اہل ایران ان اسماء کا انکشاف کر کے جب اس دنیا میں حقیقی وارث ہونے کا حق ادا کریں گے تب انسانیت اپنے کمال کو پہنچ جائے گی اور بشریت کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

حضرت علامہ اقبال حقیقی معنوں میں الشاعر تلمیذ الرحمان کے مصداق تھے۔ وہ نابغہ روزگار، تبحر عالم اور اپنے عہد کے عظیم فلسفی تھے۔ اللہ نے ان کو ایک ایسے وجدان سے نوازا تھا جو ایک حدیث کے مطابق ایک نبی کے بعد کسی عام آدمی کو جو بشریت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جائے ودیعت کیا جاتا ہے جو ایک نبی کے وجدان کا چالیسواں حصہ ہوتا ہے، یہ وجدان اقبال جیسی مستقبل بیں شخصیت کو عطا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک واقعہ جو عالمی سطح پر رونما ہونے والا ہے اس کی پیشین گوئی انہوں نے بہت پہلے کر دی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز قائم ہوئی جو موجودہ اقوام متحدہ کے طرح کا ایک ادارہ تھا۔ اس کے ختم ہونے کی پیشین گوئی علامہ اقبال نے کر دی علامہ کی عالمی واقعات پر گہری اور باریک بیں نظر تھی وہ ہر واقعہ پر گہری بصیرت رکھتے تھے انہوں نے اپنے ان خیالات کو ''جمعیت اقوام'' کے عنوان سے ایک نظم میں ظاہر کیا ہے۔ وہ نظم ملاحظہ ہو:

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منھ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

یہ پیشین گوئی علامہ اقبال نے اپنی وفات سے تقریباً دو سال پہلے کر دی تھی اور یہ دوسری عالمی جنگ جو جمعیت اقوام کے خاتمے کا باعث ہوئی ان کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد شروع ہوئی جو ۱۹۴۵ء تک چلتی رہی۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کی تشکیل ہوئی۔ اب دیکھئے اقوام متحدہ کا خاتمہ کب ہوتا

ہے اور ایک نئی تنظیم اور ایک نیا عالم نو کب وجود میں آتا ہے۔

''غلاموں کی نماز'' کے عنوان سے ایک اچھی نظم ہے جس میں اقبال نے آزاد اور غلام مسلمانوں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا تعلق بھی سیاسی پہلو سے ہے وہ اس لئے کہ ۱۹۳۵ء کے آغاز میں ترکی وفد ہلال احمر لاہور آیا تھا اور علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد اس وفد کے ارکان نے ان سے درخواست کی کہ شاہی جامع مسجد کے جلسہ میں جو بعد نماز منعقد ہوگا، ضرور شرکت فرمائیں۔ اختتام جلسہ کے بعد رئیس الوفد نے علامہ اقبال سے امام کے طویل قرات وسجدہ پر اپنے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ اقبال حساس طبیعت کے حامل تھے انہوں اس واقعہ کو شعری پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ایک آزاد اور حریت پسند مسلمان ہوتا ہے اس کا ہر فعل اسلام سے تعلق رکھتا ہے وہ کھاتا بھی ہے تو اسلام کے لئے کھاتا ہے تاکہ اس لئے جی سکے کہ وہ اپنی قوت سے اسلام کی خدمت کرے گا اپنے قوت بازو سے اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے لیکن ایک غلام مسلمان صرف تن آسانی اور شکم سیری کے لئے کھاتا ہے۔ غلامی سے اسکی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ سونے کو پیتل اور پیتل کو سونا سمجھنے لگتا ہے۔ اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضد ہیں جو اصل میں مومن ہوگا تو وہ ذہنیت کے اعتبار سے آزاد ہوگا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوگا۔ آزاد قوموں کے افراد کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے ہر وقت مصروف عمل رہنا پڑتا ہے وہ جہاد کی تیاریوں میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن غلاموں کو غلامی کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا غلاموں کی نظر میں روز و شب ساکن رہتے ہیں کیونکہ زمانہ تو حرکت کا نام ہے اور غلام میں حرکت عمل ہوتی نہیں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان طویل سجدہ کرتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ طویل سجدہ کے علاوہ ان غریبوں کو کام بھی کیا ہے۔ ٹوپی پہننا فرض ارکان سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ٹخنے تک پینٹ کو موڑنا فرض سے کم نہیں سمجھتے۔ جو لوگ پینٹ نہیں موڑتے ان کو بہت برا تصور کرتے ہیں اور ہر وقت تسبیح کے دانے لئے پھرتے ہیں حالانکہ تسبیح پڑھنا خواتین کو سکھایا گیا تھا جو تسبیح فاطمہ کے نام سے معروف ہے لیکن سب سے زیادہ مرد ہی تسبیح فاطمہ پڑھتے ہیں۔ یہ غلاموں کی ذہنیت ہے۔ ہر وہ کام کرتے ہیں جس میں جسم کو زیادہ تکلیف نہ دینا پڑے۔ اسی واقعہ کو اقبال نے نظم کی صورت

دی ہے۔ وہ نظم ملاحظہ ہو:

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مرد مجاہد، وہ مومن آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نماز غلام
ہزار کام ہیں مردان حر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے کہ مرور غلاموں کے روز وشب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

ضرب کلیم کی نظم جو ''فلسطینی عرب سے'' کے عنوان سے ہے۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا سیاسی مسئلہ ہے۔ وہ فلسطین جو بلفور اعلامیہ کی بھینٹ چڑھ گیا آج کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تو مشرق وسطی تو مشرق وسطی ساری دنیا اس آگ میں جل سکتی ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش ولذتِ نمود میں ہے

اس نظم میں اقبال نے عربوں کو انگریزوں کے طلسم سے رہائی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔
اقبال رات و دن عربوں کے غم میں گھلتے رہتے تھے۔ بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی:

> ''علامہ مرحوم نے خود ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ مجھے عربوں سے غیر معمولی محبت ہے کیونکہ یہ لوگ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نسبت رکھتے ہیں، یعنی عربی بولنے والے ہیں، وہ زبان، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلم فرماتے ہیں۔'' (۴)

اے فلسطین کے عرب! میں جانتا ہوں کہ تیرے وجود میں ابھی تک وہی آتش موجود ہے جس کے سوز سے زمانہ ابھی تک فارغ نہیں ہوا ہے یعنی کفارِ فرنگ مطمئن نہیں ہیں کہ ہم نے عربوں کو زیر کر لیا ہے۔ وہ آگ جو صلاح الدین ایوبی نے بھڑکائی تھی بجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ سوز سے اقبال کی مراد جذبہ جہاد ہے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پیدا ہوا تھا، ابھی تک تیرے اندر موجود ہے۔ تم کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں کہ تیرے مسئلہ کا حل نہ جنیوا میں ہے اور نہ فرنگیوں کے پاس ہے وہ اس لئے کہ فرنگی تو خود یہودیوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر تجھے غلامی سے باہر نکلنا ہے تو اپنی خودی کو فولاد بنا اور جذبہ جہاد سے سرشار ہو جا تبھی تجھے اس سے نجات مل سکتی ہے۔ موجودہ حالت پر اگر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلسطینیوں نے علامہ اقبال کی ہر بات پر پوری دل جمعی سے عمل کیا اور اس وقت یعنی ۲۱ نومبر ۲۰۱۲ء میں اسرائیل اور فلسطینی تنظیم حماس سے جو لڑائی چل رہی ہے اس لڑائی میں حماس نے ثابت کر دیا ہے کہ ایک ممولہ کس طرح شہباز سے ٹکرا سکتا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا:

لڑادو ممولے کو شہباز سے

ممولے نے شہباز کو یعنی حماس نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا دیا ہے اور اعلان بلفور کے بعد پہلی

مرتبہ باعزت سیز فائر کی حالت میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ علامہ اقبال کی دعاؤں اوران کی نیک خواہشات کا پرتو دکھائی دیتا ہےاورایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دن دورنہیں جب اسرائیل نام کی کوئی سلطنت اس دنیا میں نہیں رہے گی۔

علامہ اقبآل کی کتاب ''ضرب کلیم'' میں ''محراب گل افغان کے افکار'' کے عنوان کے تحت نظموں کی ایک سیریز ہے جس میں بیس نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں علامہ اقبآل نے افغان قوم کے تعلق سے فکری اعتبار سے مختلف جہتوں کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے محراب گل افغان کی زبان سے اپنے افکاراور خیالات کا اظہار کیا ہے یہ ایک فرضی نام ہے۔ علامہ اقبآل ساری عمر ملت اسلامیہ کے درد میں تڑپتے رہے۔ اس درد ملت کا راز یہ ہے کہ وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت کرتے تھے اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی تباہی ان سے برداشت نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر افغان بیدار ہوجائیں تو شاید ایشیاء میں اسلام اور مسلمانوں کو سربلندی حاصل ہوجائے۔ اس لئے انہوں نے ساری عمر افغانوں کی خودی کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب رقمطراز ہیں کہ ۱۹۳۳ء میں افغانستان جانے سے کچھ دنوں پہلے میرے ایک اعتراض کے جواب میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ

> ''تم جذباتی ہواس لئے نادرشاہ سے ناراض ہو یہ دیکھو کہ بچہ سقہ کو ختم کر کے اس نے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ میں جلب منفعت کے لئے نہیں جارہا ہو مجھے محض اسلامی اخوت کا جذبہ کھینچے لئے جارہا ہے کیا عجب کہ میں اس قوم کی بیداری میں کوئی حصہ لے سکوں۔'' (۵)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب مزید رقمطراز ہیں کہ

> ''ہندوستان کے مسلمان توکئی سو سال سے غلامی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ انگریز کا مقابلہ اگر کر سکتے ہیں تو وہ مسلمان کرسکتے ہیں جو پشاور اور کابل کے درمیانی علاقے میں

رہتے ہیں کاش اللہ کا کوئی بندہ ان کوہستانی شیروں کو بیدار
کر سکے۔''(۶)

یہی وہ جذبات تھے جس نے علامہ اقبال کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ ان افغان شیروں کو بیدار کریں اور ان سے دنیا کی امامت کا کام لیں۔ وہ ہندوستان سے بالکل مایوس ہو چکے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں لوگ حقیقی آزادی اور حریت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ان نظموں میں اقبال نے در پردہ مسلمانوں کو اس سچائی سے روشناس کرایا ہے کہ کوہستانی، صحرائی یا بدوی زندگی خودی کی تربیت کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک بدوی اور کوہستانی قوم کا انتخاب کیا جس کے اندر جفاکشی ہوتی ہے اور اس کے اندر شہباز اور چرغ کی خصوصیات ہوتی ہے۔

افغان قوم کو خطاب کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں کہ

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

محراب گل یعنی اقبال فقرِ غیور سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میں انگریز کی غلامی اختیار کرلوں تو آج میری ظاہری حالت میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسرے غلاموں کی طرح ہمیں بھی خلعت فاخرہ عنایت ہوگا لیکن اس خلعت پر جو ضمیر فروشی کے بعد حاصل ہو اپنی پھٹی ہوئی شلوار کو ترجیح دیتا ہوں۔

اقوام عالم میں رقابت کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔ خدا کی نظر میں سب قومیں یکساں ہیں کوئی قوم اس کی محبوب نہیں ہے جو قوم بھی اس کے قوانین کی پابندی کرے گی وہ دنیا میں سربلندی حاصل کرے گی۔

تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ خودی میں ڈوب جائیں یعنی اپنی خودی کی تربیت کر کے اسے نقطہ کمال تک پہنچا دیں اور اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ اس راہ میں اگر پریشانیاں، مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئیں تو ہرگز کبیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ یہ زخم در پردہ اہتمام رفو ہے کیونکہ خودی آزمائشوں کی بھٹی میں پڑ

کر کندن بنتی ہے۔ تم یورپی اقوام کی ظاہری شان وشوکت سے ہرگز مرعوب نہ ہونا اگر تو اس صداقت کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار دے تو جس طرح تخلیق اور ربوبیت کائنات میں کوئی ہستی اللہ تعالی کی شریک نہیں اسی طرح حکومت اور فرماں روائی میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت (روس وامریکہ) تجھ کو زیر نہیں کر سکے گی۔

اسی کو اقبال نے اپنے اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے:

حقیقت ازلی ہے رقابتِ اقوام
نگاہِ پیر فلک میں نہ میں عزیز، نہ تو
خودی میں ڈوب زمانے سے ناامید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمام رفو
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہ

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان افغانیوں نے پہلے روس کو ناکوں چنے چبوائے اور اب امریکہ اور اس کے حوارین اس تلخ حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں۔ امریکہ جو اس وقت ۲۰۱۲ء میں ابھی بھی افغانستان میں قابض ہے ۲۰۱۴ء تک افغانستان سے انخلا کا اعلان کر چکا ہے۔ ان امریکیوں کو افغانیوں نے ہر ہر قدم پر رسوائی سے دوچار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تو بیشک ممکن نہیں ہے کہ تیری دعاؤں سے اللہ اپنے فیصلوں کو بدل دے یعنی ہوگا تو وہی جو وہ چاہتا ہے مگر ایسا اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یقیناً انقلاب پیدا ہو جانا ممکن ہے۔ اللہ تعالی قرآن میں فرماتا ہے۔ **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر ما بانفسھم۔** یعنی بیشک اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم پہلے خود اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں تبدیلی نہ کرے۔

قرآن حکیم شعور میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جب کسی قوم کے شعور میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے تو وہ قوم اپنی خودی میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور جب کسی قوم کی خودی میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے

تو پھر قوم دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ اسی چیز کو اقبال نے ان اشعار میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔

تری دعا سے تو قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خود میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
وہی شراب وہی ہائے و ہو رہے باقی
طریقِ ساقی و رسم کدو بدل جائے

خاص کر اس سیریز کی ساتویں نظم میں زیادہ کھل کر اور زیادہ واضح انداز میں افغان کو پیغام دیا ہے کہ ترکی اور شام میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور ہندوستان میں تبدیلی ہو رہی ہے اے فرزندان کوہستان تو کب تک سوتا رہے گا۔ اللہ تعالی نے تیرے اندر بڑی صلاحیتیں ودیعت فرمادی ہیں، تیرا فرض یہ ہے کہ تو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا میں اسلام کو سربلند کرے۔ ''اپنی خودی پہچان'' کا مطلب اقبال کی اصطلاح میں یہ ہے کہ اے غافل افغان! اسلامی خطوط پر اپنی خودی کی تربیت کرتا کہ تو ایشیا میں تمام قوموں کا سردار بن جائے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی فرماتے ہیں کہ اقبال نے ان سے یہ بات بتائی تھی کہ:

''اگر سرحد کے پٹھانوں میں کوئی شخص صحیح اسلامی شعور پیدا کر دے تو یہ لوگ اسلام کو دوبارہ سربلند کر سکتے ہیں ساری دشواری یہ ہے کہ انہیں اپنی طاقتوں کا علم ہی نہیں ہے۔'' (۷)

اس سیریز کی اٹھارہویں نظم میں اقبال نے واضح طور پر اور کھل کر دو قبیلوں کے تعلق سے واضح انداز میں دعا فرمائی ہے۔ وہ دونوں قبائل وزیری محسود ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ امریکہ جو اس وقت افغانستان پر قابض ہے ان دونوں قبائل پر جو بھی پاکستان کے علاقے میں ہیں۔ ڈرون سے فوقتاً فوقتاً

حملے کر رہا ہے۔ انہی قبائل کے تعلق سے اقبال نے ۱۹۳۶ء میں اپنی اس نظم میں دعا کی ہے کہ خدا نصیب کرے تجھ کو ضربِ کاری۔

وہ نظم ملاحظہ ہو:

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے
کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے، انہیں نام وزیری و محسود
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری
وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربِ کاری

ان باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا کہ اقبال کی فکری بصیرت اور مستقبل کے تعلق سے ان کی نوید کس قدر موثر ہے۔ ان کی جو جو خواہش ہے وہ تقریباً پوری ہو رہی ہے اور پوری ہونا باقی ہے۔ اس کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تاریخ بن رہی ہے۔

علامہ اقبال کی آخری تصنیف ''ارمغان حجاز'' میں 'ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض' کے عنوان سے نظموں کی ایک سیریز ہے جس میں انیس نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ کشمیریوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا جائے جو اپنی غفلت شعاری اور تن آسانی سے غلامی کے حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کشمیری قوم کو ۱۸۴۹ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ بارڈنگ نے پچھتر لاکھ روپے کے عوض ڈوگروں کے سردار گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ یہ دنیا کی عدیم المثال ذلت ہے جو ایک قوم پر تھوپ دی گئی تھی۔ ایسی دوسری نظیر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی۔ واقعہ ہے کہ ایک قوم کو بھیڑ بکریوں کی طرح ایک حکمراں نے دوسرے تاجروں کے ہاتھوں چالیس پیسے فی فرد کے حساب سے بیچ

دیا ہو۔اس سے بڑی بے عزتی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ یہ روئے زمین کی سب سے بڑی بے عزتی کی بات تھی کہ کس طرح انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا گیا۔اس سے علامہ اقبال کا دل تڑپ اٹھا۔اقبال کا دل کیوں نہ تڑپے ایک تو اقبال کا تعلق بھی اسی کشمیری قوم سے تھااور دوسرے یہ کہ اقبال کا دل ہر وہ مظلوم قوم کو مصیبت میں دیکھ کر تڑپ جاتا تھااور اس کی نجات کی خواہش ان کے دل میں مچلنے لگتی تھی۔

ملازادہ ضیغم ایک فرضی نام ہے۔ ضیغم شیر کو کہتے ہیں۔مراد اس سے یہ ہے کہ اقبال کشمیریوں میں شیروں کی صفات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے کشمیر کے مسلمانوں سے مخاطب ہوکر یہ بات کہی ہے کہ اے کشمیر کے مسلمانو! اگر تمہارے علماء اور صوفیا تمہارے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا نہ کرسکیں یا اگر تمہارے دلوں میں یہ ولولہ پیدا نہ کرسکے تو بہر صورت دین کی اس دنیا میں کوئی قدر ومنزلت باقی نہیں رہ سکتی۔وہ اس لئے کہ اس ترقی کے دور میں جو دین داروں کے اندر سر بلندی کا جذبہ اور آزادی کا ولولہ پیدا نہیں کرسکتا وہ دین نہیں ہے بلکہ یا تو افیون کی گولی ہے یا موت کا پیغام۔

اقبال فرماتے ہیں کہ اب ''منبر ومحراب'' یعنی دین اسلام سے ہنگامہ برپا کیوں نہیں ہوتا بظاہر ہم بھی اسی دین کے پیرو ہیں جس کی پیروی کا فخر سلطان ٹیپو شہید کو حاصل تھا لیکن ہم انگریز کے خلاف اعلان جہاد نہیں کرسکتے۔اسی کو اقبال نے اپنے شعر میں واضح کیا ہے کہ:

گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندہ مومن کے لئے موت ہے یا خواب

اے وادی لولاب

آج کل کشمیر کے مولوی اور ملاؤں کی نظر فراست کے نور سے بالکل خالی ہوچکی ہے۔رسول اللہ کی حدیث ہے: **اتقوا فراسة المومن فهو ينظر بنور الله** ۔تم مومن کی فراست سے بچو پس وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ مومن اب نظر نہیں آتے۔اقبال نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ صدیوں

سے کشمیر میں کوئی ایسا مردِ مومن درویش پیدا نہیں ہوا ہے جس کی روحانیت سے وہاں کے باشندوں میں کوئی انقلاب پیدا ہوسکتا۔

اس نظم میں اقبال کشمیریوں کی غلامی پر ماتم کناں نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور وفقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
سینہ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردی ایام کی
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تردماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

اقبال کہتے ہیں کہ انقلاب زمانہ تو دیکھو آج وہ کشمیری غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو اپنی نفاست، ذہانت ودانشمندی اور تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے ایرانیوں کے ہم پلہ ہیں۔ جب کوئی قوم کلمہ حق کہنے کے بجائے کسی راجہ مہاراجہ سے مرعوب ہوکر اس کی غلامی اختیار کرلے تو فرشتوں کے سینوں سے بھی بے اختیار آہ نکلتی ہے۔ کشمیری مسلمان غلامی کا طوق اپنے کندھے پر رکھ کر جن مصائب میں گرفتار ہوگیا اور جن مصیبتوں کا شکار ہوگیا ان کی داستاں کسی انسان سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوہستان کے دامن میں ان دہقانوں کا ہر گھر غم خانہ بنا ہوا ہے اور زبان سے باشندوں کی غربت، مصیبت کی داستاں سنا رہا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ قوم جو حسب ونسب کے اعتبار سے اس قدر اعلیٰ ہے اور ایسی ہنر مند ہے اور اس قدر ذہین ہے وہ یوں غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس نظم کے آخری مصرع میں اقبال اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ وقت کب آئے گا جب یہ قوم غلامی سے آزاد ہوگی۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب غلامی کی ذلت اور مصیبت سہتے سہتے غلام قوم اس زندگی سے عاجز آجاتی ہے تو اس کے اندر آزادی کا جذبہ بیدار ہوجاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے اس قوم کا خون تاؤ کھانے لگتا

ہے۔رفتہ رفتہ ان کا دل ظن وتخمین یعنی شکوک وشبہات سے پاک ہو جاتا ہے۔وہ اپنے لئے ایک راہ چن لیتی ہے۔وہ خیالی دنیا سے نکل کر عملی دنیا میں آجاتے ہیں ان کے اندر حصول آزادی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔جس کے بعد اس کے اندر سستی، کاہلی، تن آسانی، عیش پسندی اور راحت کوشی یہ تمام خرابیاں اور برائیاں دور ہو جاتی ہیں۔آزادی کا جذبہ افراد کو ان تمام عیوب سے پاک کر دیتا ہے۔اس کے بعد وہ مقابلے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔جب یہ تمام خصوصیات اس غلام قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں تو افراد جسد واحد کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔اس کے ضربتِ پیہم سے ملوکیت کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔

اسی کو اقبالؔ نے اپنی اس نظم میں ظاہر کیا ہے:

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو ورنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمین سے انسان کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو!
ضربت پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگین دل وآئینہ رو

اقبال نے اس محکوم قوم کو تمام راہیں بتائی ہیں کہ تم کو آزادی کے حصول میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور کن کن خصوصیات کی وجہ سے تم آزادی سے ہمکنار ہو سکتے ہو۔

اقبال کی یہ نظم ملاحظہ ہو:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ ودلگیری

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

اس نظم کے مخاطب کشمیر کے مسلمان ہیں۔ اس لئے ہم اسی کی طرف اسے منسوب کرتے ہوئے یہ بات کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تیری حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب تو اپنے اندر انقلاب پیدا کر یعنی خانقاہوں سے نکل کر باطل کے مقابلے میں صف آرا ہو جا جس طرح حضرت حسینؓ یزید کے خلاف کربلا میں صف آرا ہو گئے تھے۔ کیونکہ خانقاہوں میں تو جس فقر کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اس کا نتیجہ سوائے ناکامی و نامرادی کے کچھ نہیں ہے۔ وہ اس لئے تیرے دین و ادب سے رہبانیت اور دنیا سے راہ فرار ہونے کی بو آ رہی ہے۔ جو قوم صرف رہبانیت کی قائل ہوتی ہے وہ چیز اس کے خاتمے کی وجہ بنتی ہے۔ اے کشمیری مسلمانو! یہ وقت بہت نازک ہے۔ ملوکیت کے شیاطینی علمبردار تجھ کو ہمیشہ غلام بنائے رکھنے کی تدابیر میں مصروف ہیں اور اس کے لئے ایسے حربے استعمال کر رہے ہیں جو بظاہر تو جاذب نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ تیرے لئے موت کا باعث ہیں۔ وہ تیرے لئے مالی امداد، مختلف پیکج اور تجھ سے خیر سگالی کے لئے وفود بھیج رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ سب تجھے غلام بنانے کی ترکیبیں ہیں۔ تو اپنی آنکھیں کھول اور اپنے بچاؤ کی فکر کر۔ اس کے بعد اقبال افسوس کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ میرے ملک کے لوگوں نے میرے پیغام کو مطلق نہیں سمجھا بلکہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اے خدا کشمیر کے مسلمانوں کے دل اسلام کی محبت سے کس طرح خالی ہو گئے ہیں کہ وہ میری باتوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دھرتے۔ ایک طویل انتظار کے بعد اب ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کشمیر میں بیداری کے آثار پورے طور سے نظر آ رہے ہیں۔ یہ صرف اقبال کی حمیت اسلامی کی دین ہے کہ اقبال نے جن جن باتوں کی اور جن جن کے لئے

دعائیں مانگیں اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی دعائے بارگاہ ایزدمیں قبول ہورہی ہیں اور بہت کچھ قبول ہونا باقی ہے۔

یہ وہ خواہش تھی جو اقبال اپنی قوم میں دیکھنا چاہتے تھے اور وہ اپنی شاعری کے ذریعہ پیامبرانہ باتیں اپنی قوم تک پہنچاتے رہے تاکہ یہ قوم ان کی زندگی میں نہ سہی آئندہ آنے والے زمانے میں شاید تبدیلی کی کوشش کرے۔

☆☆☆

کتابیات

(۱) بانگ درا مع شرح از: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

صفحہ: ۲۳۔۲۴، ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (پرائیویٹ لمیٹیڈ) سرسید احمد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

(۲) ایضا صفحہ: ۴۱۹

(۳) ایضاً صفحہ: ۶۵۲

(۴) بال جبریل، از: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

صفحہ: ۴۴۲، ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس (پرائیویٹ لمیٹیڈ) سرسید احمد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

(۵) ایضاً صفحہ: ۴۵۰

(۶) ایضاً صفحہ: ۴۵۰

(۷) ایضاً صفحہ: ۴۹۰

☆☆☆

خلاصہ کلام

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے توسط سے ساری انسانیت اور بالخصوص امت مسلمہ کو جو آفاقی پیغام دیا ہے۔ وہ ساری انسانیت کے درد کا مداوا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے توسط سے نو استعماریت کے خلاف محکوم اقوام کو بیدار کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، وہ صرف انہی کا خاصہ ہیں۔ ہزاروں سال نرگس نے اپنی بے نوری پر جو آنسو بہائے ہیں انہیں کے طفیل اقبالؔ جیسی دیدور شخصیت پیدا ہوئی ہے یہ شخصیت جب ایک طائرانہ نظر خود اپنے ملک، ساری دنیا اور بالخصوص عالم اسلام پر ڈالتی ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔ اس مرحلہ پر وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں وہ ان ظالموں کے خلاف اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قوموں کے اندر ان کی خودی کو بیدار کرنے کی کوششیں کریں گے۔ جب ان کی خودی بیدار ہو جائے گی تو یہ محکوم اور مظلوم قومیں اپنی خودی اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ظلم، اور غلامی اور نو استعماریت کی زنجیروں کو توڑ دیں گی۔ اس کے بعد ساری انسانیت عدل وانصاف سے مستفید ہو سکے گی۔

ابتدا میں اقبالؔ کی شاعری زیادہ تر وطن کی محبت میں سرشار نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے کروٹ بدل رہا تھا۔ ایک طرف اپنی غلامی، پسماندگی اور محکومی کے اسباب تلاش کئے جا رہے تھے اور سماج اور معاشرہ کی اصلاح کے ساتھ عظمت رفتہ کی بازیافت کی کوششیں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف ایک نئی دنیا اور نئے سماج کی تعمیر کا خواب دیکھا جا رہا تھا۔ ہمالہ، تصویر درد، ترانہ ہندی، نیا شوالہ جیسی نظمیں اس عہد کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ اس کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں اور کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے ان کی فکر میں ایک زبردست تبدیلی ہوتی ہے۔

وطن کی محبت میں سرشار اقبال کو اچانک محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی سمت میں جار ہے ہیں جو یقیناً ان کا مطمع نظر نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری ایک اور قالب میں ڈھلنے لگتی ہے مگر یہ تبدیلی ان کے یورپ کے قیام اور وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کے براہ راست اور بغور مشاہدہ کا نتیجہ ہے کیونکہ یورپ میں ہی انہوں نے سرمایہ داری، مادہ پرستی، اخلاقی قدروں کی پامالی، امتیاز رنگ وخون اور نسلی تفاخر پر مبنی جارحانہ وطن پرستی کے مظاہر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور محسوس کیا کہ وطنیت کا خمار دور سے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب قریب سے اس کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کے اندر کی چنگیزیت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کو وطنیت جیسی کسی چہار دیواری میں مقید کرنے کے بجائے ساری دنیا اور ساری انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے محکوم قوموں کو بیدار کرنے کا فیصلہ کیا جنہیں دنیا کی نو استعماری طاقتیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے غلام بنانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اقبال پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی وطنی شاعری سے ملی شاعری کی طرف پلٹے تو صرف ایک اسلامی شاعر بن کر رہ گئے۔ یہ الزام سراسر غلط اور ان کی شاعری اور پیغام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے دوسرے دور کی شاعری کا محور اسلام ہے مگر ان کی فکر میں اسلام مخصوص رسوم، عبادات اور عقائد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک فعال، سرگرم اور متحرک نظریہ حیات ہے۔ جس میں حریت، آزادی، بے نیازی، زور حیدری اور فقر بوذر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور جو ہر ظلم و جبر، محکومی اور غلامی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اقبال اگر محدود معنوں میں اسلامی شاعر ہوتے تو بال جبریل کی طویل نظم ساقی نامہ میں چین کے تعلق سے یہ پیشین گوئی نہ کرتے کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب سرمایہ دارانہ نظام کا بانی ایک مداری کی طرح اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جائے گا تو یہ گراں خواب چینی جنہیں فرنگیوں نے افیم کھلا کھلا کر مدہوش کر رکھا ہے وہ اس نظام کی جگہ ایک متبادل نظام فراہم کریں گے۔ جب ہم آج کے حالات پر غور کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے تین چوتھائی صدی قبل جو پیشین گوئی کی تھی وہ ہو بہو صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ چین ایشیا میں معاشی اعتبار سے سب سے طاقت ور ملک بن چکا ہے اور صرف امریکہ سے ہی پیچھے ہے۔ اب یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ وہ چند سالوں میں دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت بن جائے گا۔ اس طرح اقبال کی چین کے تعلق سے پیشین گوئی

حقیقت بن رہی ہے۔ چین کے بارے میں ان کی یہ پیش گوئی محکوم اور زیردست قوموں کے ساتھ ان کی ہمدردی اور وابستگی کا ثبوت ہے۔

سیاسی اور تاریخی حالات پر گہری نظر ان کے تجزیہ کی غیر معمولی صلاحیت اور ان کے حوالہ سے مستقبل میں جھانکنے کی جو غیر معمولی صلاحیت اقبال کو ودیعت ہوئی تھی وہ ہمیں ان کے کلام میں ہر جگہ نظر آتی ہے چنانچہ جب ہم عالم اسلام پر نظر ڈالتے ہیں خواہ وہ ایران، خواہ وہ فلسطینی عرب، خواہ افغانستان ہو خواہ کشمیر ہو، ان تمام اقوام کے تعلق سے انہوں نے جو پیشین گوئی کی ہے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی نوے سال گذرنے کے بعد پوری ہونے جارہی ہے اور مسجد قرطبہ کے آخری دو بندوں میں یورپ کی تاریخ کے تجزیہ کے بعد روح مسلمان میں جس اضطراب کے کروٹیں لینے کا ذکر تھا وہ اب صاف نظر آرہا ہے۔ سب سے پہلے ہم ایران کو لیتے ہیں اقبالؔ نے ''ضرب کلیم'' میں ''جمعیت اقوام مشرق'' کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے پیشین گوئی کی ہے کہ طہران اگر عالم مشرق کا جنیوا ہو جائے تو شاید مشرق کی تقدیر بدل جائے۔ جب اس مختصر پیشین گوئی کو موجودہ زمانے کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پیشین گوئی صد فیصد درست ہونے جارہی ہے۔ ایران آج فکری، سائنسی، عسکری، معاشی طور سے ایک طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ ایران جس کے تعلق سے اقبال کے عہد میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ ایران جس کو ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ نے ایک خفیہ معاہدہ کے تحت آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ آج اسی ایران میں ایک سے ایک بڑھ کر عبقری شخصیت موجود ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے اور وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب اقبالؔ کی تہران کے مشرق کا جنیوا بننے کی پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہو کر رہے گی۔

اسی طرح اقبال نے ضرب کلیم کی نظم ''فلسطینی عرب سے'' میں فلسطینی کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ تیری دوا نہ تو جنیوا میں ہے نہ لندن میں ہے بلکہ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فرنگی جس کو تو اپنے درد کا درماں سمجھتا ہے درحقیقت وہ یہودی کے پنجے میں پھڑ پھڑا رہا ہے جو خود بے بس ہو وہ تمہاری کیا مدد کرسکتا ہے۔ اگر تجھ کو اپنی مدد کرنی ہے تو اپنی خودی کو فولاد بنادے تب ہی تو کامیابی سے

ہمکنار ہوسکتا ہے۔ جب ہم آج کے فلسطین پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے فلسطینیوں کو جو نصیحت کی ہے وہ قوم ان کی نصیحت پر پوری طرح سے دلجمعی سے کاربند ہے۔ ابھی نومبر ۲۰۱۲ میں اسرائیل اور حماس کے درمیان ہونے والی جنگ میں پہلی مرتبہ فلسطینیوں نے اسرائیل پر اپنی برتری کو ثابت کردیا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اقبال کی دعائیں بارگاہ ایزدگی میں مستجاب ہوئی ہیں۔

اسی طرح جب ہم افغانستان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جس قوم کو برطانیہ، روس اور اب امریکہ اور اس کے حلیف ناٹو ممالک زیر کرنے کی بے جا کوشش کررہے تھے وہ اپنی خودی پہچان رہی ہے اور اب امریکہ اور اس کے حوارین نے وہاں سے ۲۰۱۴ء تک مکمل انخلا کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس قوم کے تعلق سے اقبال نے اپنی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' میں ''محراب گل افغان کے افکار'' کے عنوان سے جو پیشین گوئی کی ہے وہ بالکل صحیح ثابت ہورہی ہے۔

اسی طرح جب کشمیر کا ذکر آتا ہے جس سے خود اقبال کا تعلق ہے تو ان کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ انہوں نے ارمغان حجاز میں ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے عنوان سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ انہوں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے ان نظموں میں جو باتیں کہی ہیں اگر یہ قوم پوری دلجمعی کے ساتھ ان پر عمل کرے تو وہ بہت جلد کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔

اسی طرح اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے چھوٹے بڑے بہت سارے سیاسی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے سیاسی شعور کی بدولت ایسی پیشین گوئیاں کی ہیں اور جو اتنے برسوں کے بعد آج کے عہد میں بالکل سچ ثابت ہونے والی ہیں۔ اسی طرح اقبال نے اس عہد کی مختلف مذہبی و سیاسی شخصیتوں پر جو تبصرے کئے ہیں وہ بھی برحق لگتے ہیں اور یہ ان کے سیاسی درک، تاریخی شعور اور گہری بصیرت کا ثبوت ہے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو اقبال کو ایسا مفکر شاعر بناتی ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

☆☆☆

کتابیات

(۱) موج کوثر — از شیخ محمد اکرام
(۲) ذکر اقبال — از: عبدالمجید سالک
(۳) اقبال۔ جہان دیگر — محمد فرید الحق
(۴) اقبال شاعر اور سیاست داں — ڈاکٹر رفیق زکریا
(۵) اقبال: جادوگر ہندی نژاد — عتیق صدیقی
(۶) بانگ درا (شرح) — پروفیسر یوسف سلیم چشتی
(۷) اقبال کامل — عبدالسلام ندوی
(۸) فکر اقبال — ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
(۹) نقوش اقبال — مولانا ابوالحسن علی ندوی
(۱۰) پاکستان، اسلام اور اقبال — کے ایم اعظم
(۱۱) نوادر اقبال یورپ میں — سعید اختر درانی
(۱۲) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم، سوم، چہارم) ثروت صولت
(۱۳) اردو انسائیکلو پیڈیا — قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں
(۱۴) حیات جاوید — مولانا الطاف حسین حالی

☆☆☆

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے